”شہر کے دوسرے کنارے سے“(احمد حسین مجاہد)

(تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ)

مقالہ برائے بی۔ایس اردو

مقالہ نگار:

توحید مظفر

رجسٹریشن نمبر:

2021-GMDB(B)-005891

نگران:

پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم

شعبہ اردو

گورنمنٹ کالج برائے طلبہ مظفر آباد

۲۰۲۵ء

"شہر کے دوسرے کنارے سے"(احمد حسین مجاہد)

(تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ)

بیچلر آف اسٹڈیز(اردو)

مقالہ نگار

توحید مظفر

رجسٹریشن نمبر:2021-GMDB(B)-005891

یہ مقالہ

بیچلر آف اسٹڈیز(اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا ہے

۲۰۲۵ء

شعبہ اردو

گورنمنٹ کالج برائے طلبہ مظفر آباد، آزاد جموں و کشمیر

بِسمِ اللّٰهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِيم

حلف نامہ

میں توحید مظفر حلفیہ بیان دیتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے۔ میں نے یہ کام گورنمنٹ کالج برائے طلبہ مظفر آباد کے بی۔ایس اردو کے طالب علم کی حیثیت سے پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم کی نگرانی میں کیا ہے اور راقم نے اس کام کو کسی جامعہ یا ادارے میں سند کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا۔

توحید مظفر

مقالہ نگار

تصدیق نامہ

زیرِ دست خطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا۔ مجموعی طور پر یہ مقالہ بی ایس کے معیار اور ہائر ایجوکیشن کے قواعد وضوابط کے مطابق ہے اور اسے اگلے مرحلے کی منظوری کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔

مقالے کا عنوان: ''شہر کے دوسرے کنارے سے''(احمد حسین مجاہد)

پیش کار: توحید مظفر **رجسٹریشن نمبر:** 2021-GMDB(B)-005891

بیچلر آف اسٹڈیز

شعبہ اُردو

نگرانِ مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم ________________

بیرونی ممتحن ________________

صدر

شعبہ اُردو

پرنسپل

فہرست

پیش لفظ

حمد و ثنا اس ذات باری تعالیٰ کے لیے جو علم و ادراک کا سرچشمہ ہے جس نے انسان کو بہ ذریعہ قلم سکھایا۔ جس نے مجھے اپنے فضل و کرم سے نوازا اور درود و سلام اس پاک ہستی یعنی پیارے آقا حضرت محمد ﷺ پر جو رحمتِ عالمین بن کر مبعوث ہوئے اور جنھوں نے انسان کو فکر و عمل کی وسعتوں سے روشناس کروایا۔

زیرِ نظر مقالہ بی۔ایس اردو کی جزوی تکمیل کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں راقم نے معاصر اردو ادب کے ایک اہم شاعر احمد حسین مجاہد کے شعری مجموعے ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' کو اپنی سندی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔اس انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ احمد حسین مجاہد نہ صرف اپنی تخلیقات کے ذریعے عصری و سماجی شعور کو نمایاں کرتے ہیں بل کہ ان کے کلام میں داخلی کرب، انسانی المیے اور امید و رجائیت کا ایسا امتزاج ملتا ہے جو اردو شاعری کے معاصر رجحانات کو ایک نئی جہت عطا کرتا ہے۔

میرے مطالعے کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ مجاہد کی شاعری فرد کی داخلی واردات سے آگے بڑھ کر عہد کے اجتماعی مسائل اور تہذیبی صورتِ حال کی آئینہ دار ہے۔تاہم ان کے اس شعری مجموعے پر جامع تحقیقی و تنقیدی کام کی کمی موجود تھی، جسے پورا کرنے کے لیے یہ مقالہ ترتیب دیا گیا ہے۔اس مقالے میں راقم نے سوانحی، ادبی اور فکری پس منظر کے ساتھ ساتھ فنی و اسلوبی پہلوؤں کا بھی تجزیہ کیا ہے تاکہ شاعر کے فن کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھا جا سکے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے تحقیقی اصولوں کے مطابق بنیادی اور ثانوی مآخذات سے استفادہ کیا گیا ہے۔کتب بینی، تنقیدی مقالات، سابقہ تحقیقی کام اور خود شاعر کے مجموعہ ہائے کلام اس سلسلے میں میرے مطالعے میں رہے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ معاصر تنقید کی روشنی میں ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' کو فکری و فنی تناظر میں پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس موقع پر میں اپنے والدین کا شکر گزار ہوں جن کی دعائیں میرے لیے سرمایۂ حیات ہیں۔اپنے نگرانِ مقالہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم کا بھی تہہ دل سے ممنون ہوں جن کی راہ نمائی، اصلاحی مشورے اور علمی معاونت کے بغیر یہ کام پایہ تکمیل تک نہ پہنچ پاتا۔

میں احمد حسین مجاہد کا بھی ممنون ہوں جو ہمہ وقت مجھے دستیاب رہے،انھوں مے میری راہ نمائی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، میں نے جب پکارا جناب حاضر رہے۔ خاص طور پہ باب چہارم میں مجاہد نے راقم کو سارا کام سمجھایا اور بتایا۔ میں احمد حسین مجاہد سے جب بھی ملا، کچھ نہ کچھ نیا سیکھنے کو ملا۔

آپی کا شکریہ کہ دورانِ تحقیق ،جنھوں نے تحقیقی موضوعات پہ مباحث چھیڑے اور اپنی آرا سے مستفید کیا۔ خاص طور پہ بہنا(بنت ارشد) کا ممنون ہوں کہ کمپیوٹر پہ تدوین میں نے آپ سے سیکھی ورنہ میں در در کی ٹھوکریں کھاتا۔اور اپنے ہم جماعت سے زیادہ بھائی، حمزہ سعید کو میں کیسے بھول سکتا ہوں جس کے مقالے کی تدوین کرنے کی وجہ سے مجھے تکنیکی امور سے آگہی میسر آئی۔

مجھے امید ہے کہ یہ کاوش اردو ادب کے طلبہ کے لیے مفید ثابت ہو گی اور احمد حسین مجاہد کے فن کے تفہیم میں اضافہ کرے گی۔

مقالہ نگار

توحید مظفر

طالب علم بی۔ایس اُردو

گورنمنٹ کالج برائے طلبہ مظفر آباد

باب اول:

احمد حسین مجاہد: شخصیت اور فن

1.1 خاندان کا تعارف:

پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں کشمیر اور ہزارہ کی مٹی، کئی نام ور ادبا کا خمیر اور مسکن رہی ہے۔ ہزارہ کا قصبہ بالا کوٹ (جو سیاحوں کی آمد سے شہر کا روپ دھار چکا ہے) تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ برعظیم کی دو بڑی شخصیات ''سید احمد شہید'' اور ''شاہ اسماعیل شہید'' یہیں مدفون ہیں۔

یہ شہر، احمد حسین مجاہد کا آبائی شہر ہے۔ آپ کا تعلق سواتی پٹھان قبیلے سے ہے، ان کے جد امجد ''دادہڑ خان'' بالا کوٹ میں آباد ہوئے تھے۔ مجاہد کے مطابق:

''ہم سواتی پٹھان ہیں۔''(۱)

مجاہد ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم ایک شاعر اور ناول نگار تھے۔ محقق محمد قدیر کے مطابق:

> ''والد کا نام غلام حسین تھا۔ جو ایک عمدہ شاعر اور بہترین ناول نگار بھی تھے۔ ان کے والد محترم اپنی تخلیق کاری کی وجہ سے اپنا تخلص ''بیکس'' استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے ایک ناول ''مقدر'' بھی لکھا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے مدرس تھے۔ خوش اخلاق اور خوش مزاج شخصیت کے مالک تھے۔''(۲)

احمد حسین مجاہد کی والدہ بھی مشرق کی روایتی ماؤں کی طرح ایک نرم مزاج دین دار اور گھریلو خاتون تھیں۔ آپ کی شادی ۲ اپریل ۱۹۹۳ء کو بالا کوٹ میں ہوئی۔ خاتون کا نام عالیہ احمد ہے۔ مجاہد نے ''اوک میں آگ'' اور ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' کو بھی اِنھی کے نام معنون کیا ہے۔ ان سے احمد حسین مجاہد کے دو فرزند ہیں؛ مشیت شناس خان اور محضر احمد خان ہیں اور ایک بیٹی طینت غنا خان ہیں۔

احمد حسین مجاہد کے گھر کے ماحول کے بارے میں انعام الحق نے لکھا ہے:

> ''آپ کے گھر کا ماحول بہت دوستانہ تھا۔ افراد خانہ بشمول کزنز کے رات گئے تک خوش گپیوں میں مصروف رہتے۔ سردیوں کی لمبی اور ٹھنڈی راتوں میں آگ سینکی جاتی۔ حلوے بنائے

جاتے۔ قہوہ پیتے جاتے ہیں اور لڈو اور تاش کی بازیاں لگائی جاتی (ہیں)۔ الغرض ''زندگی زندہ دلی کا نام ہے'' کے مصداق ان کے گھر کا ماحول بھی بڑا زندہ تھا۔''(۳)

1.2 پیدائش:

احمد حسین مجاہد کی تاریخ پیدائش کے بارے میں دو کتب نے معمے میں ڈال رکھا ہے۔ یہ دو کتابیں: ''ہزارہ میں اردو زبان وادب کی تاریخ'' از بشیر احمد سوز اور ''ادبستانِ ہزارہ'' از پروفیسر ایوب صابر ہیں۔ پروفیسر ایوب صابر نے احمد حسین مجاہد کا تعارف کچھ اس طرح کروایا ہے:

> ''احمد حسین مجاہد ۲۲ اگست ۱۹۵۹ء کو بالا کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد غلام حسین بیکس بھی شعر گوئی سے دلچسپی رکھتے تھے۔''(۴)

پروفیسر بشیر احمد سوز کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> ''احمد حسین مجاہد ۲۳ اگست ۱۹۵۹ء کو بالا کوٹ ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے۔''(۵)

(واضح رہے کہ یہ معلومات کتاب کے صفحہ نمبر ۲۴۶ پر درج ہیں نہ کہ صفحہ نمبر ۲۴۲ پر)

دستاویزات اور تاریخی ریکارڈ کے مطابق احمد حسین مجاہد ۲ مارچ ۱۹۶۱ء کو بالا کوٹ میں پیدا ہوئے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کی شائع کردہ احمد حسین مجاہد کی کتاب ''رموزِ شعر'' کے پس ورق پر بھی یہی تاریخ پیدائش درج ہے:

> ''احمد حسین مجاہد 2 مارچ 1961 کو ہزارہ (خیبر پختونخواہ) کے تاریخی قصبے بالا کوٹ میں پیدا ہوئے۔(۶)

1.3 تعلیم و تربیت:

احمد حسین مجاہد کی تعلیم کا آغاز قرآن پاک سے ہوا۔ یوں ماں کی گود کے بعد مسجد ان کی دوسری درس گاہ بنی۔ مجاہد نے ۱۹۷۳ء میں گورنمنٹ پرائمری اسکول، بالا کوٹ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر گورنمنٹ ہائی سکول بالا کوٹ سے ۱۹۷۷ء میں میٹرک اور ۱۹۸۳ء میں زرعی یونیورسٹی پشاور سے سماجی سائنس میں بی ایس سی (آنرز) کی سند حاصل کی۔ اس کے علاوہ ۱۹۹۵ء میں اسلام آباد کے ادارے ''نیشنل انسٹیٹیوٹ آف جرنلزم'' سے سندِ صحافت وصول کی۔ کل پاکستان میں تیسرے نمبر پر آئے۔ اردو زبان وادب سے محبت نے آپ سے ۲۰۱۳ء میں جامعہ ہزارہ سے ایم۔ اے اردو کا

امتحان بھی پاس کروالیا۔ مجاہد کو اب بھی کسی علمی مجلس کی دعوت دی جائے تو وہ وہاں حاضر ہوتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ ان کے ہاں کتب خانہ بھی ہے جس میں سینکڑوں کتب موجود ہیں۔

1.4 ملازمت:

احمد حسین مجاہد نے ۱۹۸۳ء میں ہی زرعی ترقیاتی بنک ایبٹ آباد سے ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۹۸ء میں آپ کا تبادلہ مظفر آباد ہوا۔ یہاں آپ آٹھ سال اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ۸اکتوبر ۲۰۰۵ء کا سانحہ پیش آیا تو یہیں اپنے دفتر میں حاضر تھے۔ ۲۰۰۶ء میں ایک مرتبہ پھر آپ کو ایبٹ آباد مقرر کر دیا گیا اور آخر تک یہیں رہے۔ یکم مارچ ۲۰۲۱ء کو ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ محمد قدیر نے اس حوالے سے لکھا ہے:

> ''احمد حسین مجاہد نے ذریعہ معاش کو اپنی ضرورت سمجھا اور ملازمت کو اپنا فرض سمجھتے ہوئے، اسے بہ طریقِ احسن نبھایا۔ مگر شاعری کی وجہ سے ہی ان کی پہچان ہوئی ہے۔''(۷)

مجاہد نے شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور ملازمت کو فرض سمجھ کر سرانجام دیا۔ اسی وجہ سے سوائے ان کے قریبی ساتھیوں کے، باقی ان کی ملازمت سے آگاہ نہیں۔

1.5 سماجی سرگرمیاں:

ادیب صرف ادب تخلیق کرتا رہے تو بھی وہ سماج کی خدمت کرنے والا کہلائے گا۔ ہزارہ کے ادیب ادب کے خالق تو ہیں ہی، سرگرم سماجی کارکن بھی ہیں۔ مثال کے طور پر واحد سراج، امان اللہ خان امان اور احمد حسین مجاہد وغیرہ۔ احمد حسین مجاہد ایک سرگرم سماجی کارکن ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ نے ۲۰۰۵ء کے ہولناک زلزلے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ سراج احمد تنولی کو دیے گئے انٹرویو میں مجاہد کچھ یوں گویا ہیں:

> '' آئرلینڈ کے لوگوں کے تعاون سے ایبٹ آباد میں افرادِ باہم معذوری کے لیے جناب واحد سراج کی قیادت میں ایک بحالی مرکز قائم کیا گیا ہے۔ جس کا میں شروع سے ٹرسٹی ہوں۔۔۔اس مرکز سے اب تک 30 ہزار سے زائد افراد مستفید ہو چکے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ مستقبل میں ہم اسی مرکز کی خدمات کو مزید وسعت دیں۔''(۸)

اس کے علاوہ احمد حسین مجاہد ایک اور تنظیم ''اینور پیشنٹ ویلفیئر سوسائٹی''، جس کے مقاصد میں کینسر کے مریضوں کے علاج معالجے میں مدد فراہم کرنا ہے، سے بھی وابستہ ہیں۔ اسی طرح کے اور کئی فلاحی کاموں میں مجاہد پیش پیش رہتے ہیں۔

1.6 تخلیقی سفر:

احمد حسین مجاہد پاکستان کے نام ور ادیب، شاعر اور کالم نگار ہیں۔ آپ کے اب تک تین طبع زاد اردو شعری مجموعے اور دو ہندکو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

محقق محمد قدیر نے آپ کے تخلیقی سفر کے آغاز پر کچھ اس صفائی سے انعام الحق کا کام نقل کیا ہے کہ اِنھی کی بات معلوم ہوتی ہے۔ انعام الحق رقم طراز ہیں:

> ''احمد حسین مجاہد کو بچپن ہی سے شعر و ادب سے لگاؤ تھا۔ یہ بات درست ہے کہ شاعر پیدائشی ہوتا ہے اور مکتبِ زمانہ اس کی نوک پلک سنوارتا ہے اور اس کے جذبات و احساسات کو پیکرِ اظہار مہیا کرنے کا قصد کرتا ہے۔ احمد حسین مجاہد بھی ایک پیدائشی شاعر ہے۔''(۹)

احمد حسین مجاہد کے والد مدرس بھی تھے اور شاعر بھی۔ اس لیے گھر میں کتب کا ذخیرہ موجود تھا۔ وہیں اِن کا کتاب سے رشتہ مضبوط ہوا جو کہ اب تک قائم ہے۔ سراج احمد تنولی کو انٹرویو کے ایک سوال کا جواب کچھ یوں دیتے ہیں:

> ''س: زیادہ تر کن کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں؟
>
> احمد: میری ذاتی لائبریری میں فلسفہ، تاریخ، طب، عروض، شاعری، فکشن، مذہب، تصوف، غرض ہر طرح کی کتابیں موجود ہیں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں ہر موضوع پر لکھی ہوئی کتاب پڑھوں اور ان سے استفادہ کروں۔''(۱۰)

شاعری کے آغاز کے بارے میں مجاہد تیسری جماعت کا ایک واقعہ سناتے ہیں۔ تیسری جماعت میں تھے کہ جب ایک اخبار نکالنا شروع کیا۔ اس اخبار کے قاری صرف مجاہد ہی تھے کیوں کہ صرف ایک ہی اخبار نکلتا تھا۔ ابتدائی شاعری اسی اخبار میں چھپا کرتی تھی جو ظاہری بات ہے بے وزن ہوتی تھی۔

انھوں نے اپنے والد کے ناول ''مقدر'' کے مسودے کو مجلد کیا اور اس پر اپنے فنِ مصوری کے جوہر دکھائے۔ انھیں اس زمانے کا ایک ہی شعر، جو اس ناول کے سرورق پر لکھا تھا، یاد ہے۔ شعر کچھ اس طرح ہے:

؎ کچھ آنسو ڈھلکے آنکھوں سے جب درد کی شدت بہت بڑھی
شمع کی مانند جلتا ہوا یہ اپنا مقدر ہے ساقی (۱۱)

غلام حسین بیکسؔ نے ہی احمد حسین کو ''مجاہد'' تخلص تجویز کیا تھا۔ ایوب صابر کے مطابق:

''یہ لفظ ان کے نام کا حصہ تو بن گیا لیکن تخلص کے طور پر وہ لفظ احمد استعمال کرتے ہیں۔''(۱۲)

مجاہد نے شعر پر اصلاح کسی سے نہیں لی۔ انھیں یہ تو نہیں یاد کہ پہلا شعر کب کہا تھا البتہ پہلا مشاعرہ پشاور میں قیام کے دوران میں پڑھا۔ بہ مطابق محمد قدیر:

''احمد حسین مجاہد نے اپنی زندگی کا پہلا مشاعرہ ۱۹۷۸ء کو شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی میں پڑھا۔ اس مشاعرے میں اردو کے نامور شعراء خاطرؔ غزنوی اور ڈاکٹر نذیر تبسم بھی موجود تھے۔''(۱۳)

جب آپ ملازم ہوئے تو ایبٹ آباد کی ادبی محفل میں آنے جانے لگے۔ چوں کہ لفظی کساد بازاری کا شکار نہ ہوئے اور سنجیدہ شاعری کو اپنایا اس لیے معتبر ٹھہرے اور مقبول ہو گئے۔ جب آپ کا تبادلہ مظفر آباد ہوا تو یہاں کی ایک ادبی انجمن ''کشمیر لٹریری سرکل (کشمیر لٹریری فورم) سے منسلک ہوئے اور اس کے پہلے صدر ہونے کا اعزاز اپنے نام کیا۔ اس سے پہلے، اس تنظیم کا صرف ایک عہدہ تھا، جنرل سیکرٹری، جس پر اعجازؔ احمد نعمانی فائز تھے۔

آپ نے ہزارہ اور کشمیر کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کیا اور ہنوز یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی شاعری، کالم اور تبصرے کئی رسائل میں اور ناول کی ایک قسط بھی اکادمی ادبیات پاکستان کے مجلے ''ادبیات'' میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ آپ اکادمی ادبیات پاکستان کی وظائف کمیٹی میں بھی شامل ہیں۔ آپ کا تخلیقی سفر رواں دواں ہے۔

1.7 ادبی تنظیموں سے وابستگی:

شعرا دنیا کے جس بھی کونے میں جائیں، وہاں کے شعرا سے جلد گھل مل جاتے ہیں۔ وہاں کی ادبی تقاریب اور مجالس میں اٹھنے بیٹھنے لگتے ہیں۔ احمد حسین مجاہد بھی جہاں گئے انھوں نے وہاں ادب کے فروغ کے لیے، ادب تخلیق بھی کیا اور وہاں کی ادبی انجمنوں میں بھی شامل رہے۔ مندرجہ ذیل اقتباسات میں ان ادبی انجمنوں کا تذکرہ آئے گا، جن میں مجاہد یا تو شامل رہے یا ان کی تخلیق میں معاون رہے۔

1.7.1 بزمِ اہل قلم:

یہ ایبٹ آباد کی ایک ادبی تنظیم تھی۔اس تنظیم کے صدر حفیظ اثرؔ اور جنرل سیکرٹری نیاز سواتیؔ تھے۔ محمد قدیر کے مطابق:

> ''بزم اہل قلم نے ان کی شاعری کو نئی جہات سے روشناس کروایا۔اس حلقے کے ذریعے ان کی نظم نگاری اور غزل گوئی کو ایک نیا اور منفرد مقام عطا ہوا۔''(۱۴)

یوں مجاہد کا حلقہ احباب وسیع ہوتا گیا اور مجاہد کی شاعری بھی نکھرتی چلی گئی۔

1.7.2 الفاظ:

احمد حسین مجاہد جب ایبٹ آباد میں ملازم ہو گئے اور وہاں کی ادبی نشستوں میں آنے جانے لگے تو آپ کو اپنے آبائی شہر میں ادبی انجمن کی کمی کا احساس ہوا۔ سو مجاہد نے وہاں ادبی تنظیم ''الفاظ'' کی بنیاد رکھی اس تنظیم نے بالا کوٹ کے مقامی شعرا کو منظر عام پر لانے میں اہم کردار ادا کیا۔انعام الحق نے لکھا ہے:

> ''اس تنظیم نے بہت سے نئے لکھنے والوں کی تربیت بھی کی اور انہیں متعارف بھی کروایا۔اختر زمان اخترؔ، عبدالوحید بسملؔ اور منور احمد منورؔ اسی تنظیم کی بدولت ادبی دنیا میں متعارف ہوئے۔''(۱۵)

۲۰۰۵ء کے سانحے میں بالا کوٹ شہر مکمل تباہ ہو گیا۔''الفاظ'' بھی اسی زلزلے کی نذر ہو گئی اور یوں یہ تنظیم غیر فعال ہو گئی۔

1.7.3 کشمیر لٹریری سرکل:

۱۹۹۸ء میں احمد حسین مجاہد کا تبادلہ مظفر آباد شہر میں ہوا۔آپ یہاں آٹھ سال رہے۔ یہاں کشمیر لٹریری سرکل (کشمیر لٹریری فورم) سے منسلک ہو گئے۔ سعدیہ برجیس ملک اس تنظیم کے اراکین کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''اعجاز نعمانیؔ کو ''کشمیر لٹریری سرکل'' کا مستقل سیکرٹری چنا گیا۔ڈاکٹر صابر آفاقی سرکل کے تاحیات سرپرست مقرر کیے گئے جبکہ صدارت کے فرائض احمد حسین مجاہد کو سونپے گئے۔ نائب صدر کے لیے مرزا زید اللہ فہیم کا انتخاب کیا گیا۔''(۱۶)

واضح رہے کہ احمد حسین مجاہد کو تنظیم کا پہلا صدر منتخب ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان سے پہلے ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۸ء تک تنظیم کا صرف ایک ہی عہدہ تھا۔ جنرل سیکرٹری کا، اس پر اعجاز احمد نعمانی فائز تھے۔

آپ ۱۹۹۸ء میں کشمیر لٹریری سرکل سے وابستہ ہوئے۔ مجاہد نے کشمیر لٹریری سرکل میں شمولیت سے پہلے ہی مضافات کے سفر بھی شروع کر دیے تھے۔ مثال کے طور پر ستمبر ۱۹۸۸ء میں ''بزم ادب اجالا''، چکار کے زیر اہتمام بوائز کالج چکار میں منعقدہ ایک مشاعرے میں آپ نے اپنا کلام سنایا۔ سعدیہ برجیس ملک لکھتی ہیں:

> ''احمد حسین مجاہد غزل سرا ہوئے تو ہر طرف واہ واہ کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔
>
> ؎ گزری ہے جو مجھ پر بتا کے لے آئے
> کوئی نہیں ہے جو اس کو منا کے لے آئے
> گزرنی تھی کڑی شب سو اس گلی سے
> ہم چراغِ نقشِ کفِ پا اٹھا کے لے آئے (۱۷)

کشمیر لٹری سرکل (کشمیر لٹریری فورم) سے احمد حسین مجاہد کا تعلق ہنوز قائم ہے۔ آخری بار ''جشن آصف ثاقب''، میں تشریف لائے تھے۔ اس سے پہلے مجاہد واحد سراج کی کتاب ''روشنی ایک حادثہ ہے'' کی تقریبِ پذیرائی کے موقع پر خورشید نیشنل لائبریری، مظفر آباد آئے تھے۔ اس کے علاوہ مجاہد ہزارہ کی دو ادبی انجمنوں ''بزم علم و فن'' ایبٹ آباد اور مانسہرہ کی ایک تنظیم ''حلقۂ یاراں شنکیاری'' کے ارکان میں شامل ہیں۔

1.8 تصانیف و تالیفات:

احمد حسن مجاہد ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ ایسے تخلیق کار ہیں، جو زمانہ طالب علمی سے ہی ادب تخلیق کرتا آرہا ہے۔ آپ نے اردو زبان و ادب کے علاوہ ہندکو ادب میں بھی فن پارے تخلیق کیے ہیں۔ آپ کی تصانیف و تالیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔دھند میں لپٹا جنگل:

یہ آپ کا سب سے پہلا اردو شعری مجموعہ ہے، جو ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ یہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ غزلوں کی تعداد زیادہ ہے مگر نظمیں کم ہونے کے باوجود عمدہ ہیں۔ایک نمائندہ نظم دیکھیے :

"امریکا

مرے

ہمسائے کی چھت سے

کوئی اس گھر میں اترے گا

کبوتر کے لہو سے

وہ میرے آنگن کے اجلے پھول

سارے سرخ کردے گا" (۱۸)

۲۔سیف الملوک:

یہ نثری داستان ہے جو وادیٔ کاغان کی لوک کہانی ہے۔یہ داستان ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔

۳۔نیرنگِ خیال کا ماہیا نمبر:

یہ ماہیا نمبر، مجاہد نے اکتوبر ۱۹۹۹ء میں تالیف کیا۔

۴۔صفحۂ خاک:

یہ کتاب آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے سانحے پر لکھی گئی ہے۔ منظر نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ منظر نگاری ایسی ہے کہ ۲۰۰۵ء کا اجڑا ہوا بالاکوٹ شہر سامنے معلوم ہوتا ہے۔یہ کتاب ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی۔

۵۔چاک پہ رکھے خواب:

احمد حسین مجاہد نے ۲۰۱۱ء میں یہ کتاب مرتب کی۔یہ معذور افراد پر لکھی ہوئی نظموں کا انتخاب ہے۔

۶۔اوک میں آگ:

یہ آپ کا دوسرا اردو شعری مجموعہ ہے، جو ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔ ایک غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

دشت تھا، دھوپ تھی، وہ یاد بھی آیا ہوا تھا
ایسی وحشت تھی کہ میں اَنت مچایا ہوا تھا
خواب، مٹی کا دیا، نام، مقام اور کلام
اس کے قدموں میں رکھا جو بھی کمایا ہوا تھا
میری ناکام محبت تھی وہ لیکن اس نے
مجھ کو مرنے سے بہر حال بچایا ہوا تھا(۱۹)

۷۔پاکستانی ادب 2011 (شاعری):

یہ کتاب آصف ثاقبؔ کے ہمراہ آپ نے مرتب کی۔ یہ اکادمی ادبیات پاکستان کا ۲۰۱۱ء کا شعری انتخاب تھا۔ یہ کتاب ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی۔

۸۔ قینچی:

ہزارہ کی ہندکو لوک داستان ہے۔ آپ نے اسے ہندکو میں نظم کیا۔ یہ ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی۔

۹۔رموزِ شعر:

رموزِ شعر اردو شاعری کے مختلف موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ ایک رہنما کتاب ہے۔ ۲۰۱۷ء میں اکادمی ادبیات پاکستان نے شائع کی۔

۱۰۔ تھذے خواب دی چھائی:

یہ مجاہد کا ہندکو شعری مجموعہ ہے۔ اس میں غزلیں، بولیاں، دوہے، ماہیے، گیت اور دیگر منظومات شامل ہیں۔

۱۱۔ منتخب کلامِ ناسخ:

یہ انتخاب ۲۰۲۱ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن نے شائع کیا۔

۱۲۔ آصف ثاقبؔ: شخصیت اور فن:

یہ کتاب ۲۰۲۱ء میں شائع ہوئی۔ آصف ثاقبؔ جو بوئی، ہزارہ کے رہائشی ہیں۔ اردو کے ایک معتبر شاعر اور ماہر عروض ہیں، کی حیات اور خدمات پر لکھی گئی۔

۱۳۔ محمد اظہار الحق: شخصیت اور فن:

محمد اظہار الحق پاکستان کے ادیب اور کالم نگار ہیں۔ان کی شخصیت پر یہ کتاب 2022ء میں شائع ہوئی۔

1.9 ادبی انعامات اور خطابات:

ادب محض تخلیق نہیں، ایک تہذیبی شعور، فکری آگہی اور جمالیاتی بصیرت کا مظہر ہوتا ہے۔ جب کوئی شاعر اپنے تخلیقی سفر میں فنی پختگی، فکری گہرائی اور تہذیبی معنویت کا حامل بن جائے تو اہل علم نقاد، ادبی ادارے اور حکومتِ وقت کی نظروں میں آجاتا ہے۔ وہ اس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اسے ادبی اعزازات اور خطابات سے نوازتے ہیں۔

احمد حسین مجاہد کا شمار اردو زبان و ادب کے ایسے شعرا میں ہوتا ہے، جنھیں ان کی تخلیقی جہتوں، فکری تنوع اور فنی سلیقے کے اعتراف میں متعدد ادبی اعزازات اور خطابات سے نوازا گیا ہے۔ زیرِ نظر سطروں میں اِنھی اعزازات اور خطبات کا ذکر کیا جائے گا۔ محمد قدیر نے ایک حوالہ اس بارے میں درج ہے، ملاحظہ ہو:

> ''اس حوالے سے ڈاکٹر سید سلیمان نے ایک اخبار ''اردو لنک یو۔ایس۔اے'' میں ان کے اعزاز کی ترتیب کچھ یوں کی ہے:
>
> یونین آف جرنلس بالاکوٹ، تحصیل بار بالاکوٹ اور ڈیسنٹ کلب بالاکوٹ نے احمد حسین مجاہد کو ''پرل آف دی سائل'' کا خطاب دیا. عمائدین بالاکوٹ نے ایک تقریب میں احمد حسین مجاہد کو بالاکوٹ کی روایتی پگڑی پہنائی اور ''فرزندِ بالاکوٹ'' کا لقب دیا۔ کشمیر لٹریری فورم، مظفرآباد نے آپ کی ادبی خدمات کے صلے میں آپ کو مظفرآباد شہر کی چابی پیش کی۔ پاکستان

ٹیلنٹ کونسل نے ۲۰۰۰ء میں آپ کو ''بہترین شاعر '' کی شیلڈ پیش کی۔ سدا بہار آرٹ کونسل نے ۲۰۱۸ء میں آپ کو ''بہترین شاعر ''قرار دیا۔احمد حسین مجاہد کے شعری مجموعے ''اوک میں آگ'' کو ننکانہ صاحب (پنجاب) کی ادبی تنظیم ''وجدان'' نے ۲۰۱۴ء میں باباجی گرونانک ایوارڈ سے نوازا۔اکادمی ادبیات پاکستان نے آپ کی ہند کو شاعری کی کتاب ''قینچی'' کو ۲۰۱۶ء کی بہترین کتاب قرار دیتے ہوئے اسے سائیں احمد علی ایوارڈ سے نوازا۔''(۲۰)

اس کے علاوہ مانسہرہ کی ضلعی انتظامیہ نے احمد حسین مجاہد کو فخرِ مانسہرہ ایوارڈ سے نوازا۔

1.9.1 صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی:

۲۳ مارچ ۲۰۲۴ء کو احمد حسین مجاہد کو صدر پاکستان کی طرف سے ''صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی'' سے نوازا گیا۔یوں مجاہد ایک قومی تمغے کے حامل ٹھہرے۔

احمد حسین مجاہد کا تخلیقی سفر رواں دواں ہے آگے بھی انہیں اعزازات سے نوازا جانے کے بھرپور امکانات ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔احمد حسین مجاہد،انٹرویو،بذریعہ وٹس ایپ،۲۷جولائی ۲۰۲۵ء،۴۷:۲ دوپہر

۲۔ محمد قدیر،''احمد حسین مجاہد کی شاعری: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ''، تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل اردو،ہزارہ یونی ورسٹی،مانسہرہ، ۲۰۲۲ء، ص ۲

۳۔ انعام الحق،''احمد حسین مجاہد کی غزل میں جمالیات''، تحقیقی مقالہ برائے بی۔ایس اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج ہری پور، ۲۰۱۹ء، ص۶

۴۔پروفیسر ایوب صابرؔ،ادبستانِ ہزارہ، بزم اہل قلم ہزارہ،ایبٹ آباد،اگست ۱۹۸۹ء، ص ۳۳۱

۵۔بشیر احمد سوزؔ،ہزارہ میں اردو زبان وادب کی تاریخ،ادبیاتِ ہزارہ،ایبٹ آباد،جون ۲۰۱۰ء، ص۲۴۶

۶۔احمد حسین مجاہد،رموزِ شعر،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد،۲۰۱۷ء، پس ورق

۷۔ محمد قدیر،ایضاً، ص۹

۸۔ خصوصی نشست ہمراہ احمد حسین مجاہد،انٹرویو نگار: سراج احمد تنولی،روزنامہ سر گرم،ایبٹ آباد،۱۶فروری ۲۰۱۹ء، ص۳

۹۔انعام الحق،ایضاً، ص۹

۱۰۔ خصوصی نشست ہمراہ احمد حسین مجاہد،انٹرویو نگار: سراج احمد تنولی،ایضاً، ص۳

۱۱۔انعام الحق،ایضاً، ص۱۰

۱۲۔پروفیسر ایوب صابرؔ،ادبستانِ ہزارہ،ایضاً، ص۳۳۱

۱۳۔ محمد قدیر،ایضاً، ص۸

۱۴۔ محمد قدیر،ایضاً، ص۱۲

۱۵۔انعام الحق،ایضاً، ص۱۱،۱۲

۱۶۔سعدیہ برجیس ملک،''آزاد کشمیر کی ادبی انجمنیں''، تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل اردو،علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد،۲۰۰۸ء، ص۱۱۴

۱۷۔سعدیہ برجیس ملک،''آزاد کشمیر کی ادبی انجمنیں''،ایضاً، ص۲۳۶،۲۳۷

۱۸۔احمد حسین مجاہد،دھند میں لپٹا جنگل،عکاس پبلی کیشنز،اسلام آباد،۱۹۹۷ء، ص۸۴

۱۹۔احمد حسین مجاہد،اوک میں آگ،سانجھ پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۴ء، ص۶۱

۲۰۔ محمد قدیر،ایضاً، ص۲۰،۲۱

باب دوم:

"شہر کے دوسرے کنارے سے" کا فکری مطالعہ

کوئی بھی طویل یا مختصر بحث شروع کرنے سے قبل ہم ادب کو سمجھ لیں۔ ادب ہم اس مواد کو کہیں گے، جو اپنے اندر عام انسان کی دلچسپی کا سامان لیے ہوئے ہو اور اس مواد کو ایک خاص ہئیت میں پیش کیا جائے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے یہ بات کچھ اس انداز سے لکھی ہے:

> "ادب کی عمارت کے دو ستون ہیں ایک کو ہم مواد(MATTER) کہہ سکتے ہیں، دوسرے کو ہئیت (FORM) کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ انہی دونوں کے حسین امتزاج کا نام ادب ہے۔"(۱)

ادب براہ راست زندگی سے متعلق ہوتا ہے۔ اس لیے ادب میں چاہے نثر ہو یا شعر، زندگی کے مختلف پہلوؤں کو قلم بند کیا جاتا ہے۔ زندگی کا تقریباً ہر واقعہ ادبی موضوع بن سکتا ہے۔ مثلاً داخلی اور خارجی وارداتیں، دنیاوی، ماحولیاتی اثرات وغیرہم۔

ادب دو صورتوں میں لکھا گیا ہے۔ نثر اور شاعری کی صورت میں۔ نثر سے نظر قطع کرتے ہوئے، میں شاعری پہ صرفِ نظر کروں گا۔ ادیب جب ادب تخلیق کرتا ہے تو عام دلچسپی کی خاطر اس کی تحریریں جذبات سے مملو ہو جاتی ہیں۔ شاعر اپنے خارجی اور داخلی جذبات کو مختلف موضوعات کی صورت میں ڈھالتا ہے۔

اردو غزل میں قلیؔ قطب شاہ سے اور اردو نظم میں نظیرؔ آکبر آبادی سے لے کر اب تک، ہمارے شعرا نے فنی خوش اسلوبیوں کے علاوہ اپنے تخیل کی بلند پروازیوں سے بھی ہمیں متاثر کیا ہے۔ ہماری اردو شاعری رنگا رنگ موضوعات لیے ہوئے ہے۔ اردو شاعری میں زندگی کے تقریباً ہر موضوع پہ کلام لکھا اور پڑھا گیا ہے۔

تقسیم سے قبل اردو کے کئی بڑے مراکز تھے؛ دہلی، لکھنؤ، کلکتہ، بمبئی (ممبئی)، حیدر آباد دکن، لاہور، کراچی وغیرہم۔ تقسیم ہوئی، اب پاکستان کے حصے میں لاہور اور کراچی آئے۔ جو طلوع ادب پر سدا بہار تاروں کی مانند اب بھی جگمگا رہے ہیں۔ ان بڑے ادبی مراکز سے دور افراد بھی فروغ ادب میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ اِنھی نمایاں ناموں میں سے ایک نام احمد حسین مجاہد کا بھی ہے۔ آپ گزشتہ پانچ دہائیوں سے ادب تخلیق کر رہے ہیں اور اردو کے ساتھ ساتھ ہندکو

ادب میں اپنی قابلیت کالوہا منوا چکے ہیں۔ مجاہد کی شاعری متنوع موضوعات کی حامل ہیں۔ان کے ہاں روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ معاصر افکار کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔آپ نئے نئے مضامین کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' اس کی تازہ مثال ہے۔اگلے چند صفحات میں ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' کے چند نمائندہ موضوعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

2.1 سانحہ ۲۰۰۵ء:

ماحول کا اثر تو ہر ادیب پر ہوتا ہی ہے۔ہر شاعر کے ہاں مقامی رنگ اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ ماضی میں اگر کوئی الم ناک واقعہ رونما ہو جائے تو اس کے اثرات دیرپا ادب میں محسوس کیے جاتے ہیں۔ایسا ہی ایک سانحہ ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء میں آزاد جموں و کشمیر اور خیبر پختونخواہ کے چند علاقوں میں زلزلے کی صورت میں آیا۔اس آفتِ ناگہانی نے پل بھر میں ہزاروں افراد کو موت کے حوالے کر دیا اور لاکھوں افراد متاثر کیے۔

مرنے والوں میں زیادہ تعداد طلبہ کی تھی، جو خستہ عمارتوں کی نذر ہو گئے۔کئی خاندان صفحۂ ہستی سے نابود ہو گئے۔خطے کا قریہ قریہ اس آفت کا شکار ہوا۔مظفر آباد شہر اور بالا کوٹ کا شہر دونوں ملبے کی صورت اختیار کر گئے۔

احمد حسین مجاہد کا وطن بالا کوٹ کی سرزمین ہے۔آپ کے کئی احباب اس زلزلے نے چھین لیے۔مجاہد اس وقت مظفر آباد کے زرعی ترقیاتی بنک میں تھے۔۲۰ سال گزر جانے کے بعد بھی وہ کسک،ان کے دل میں موجود ہے۔ زلزلے کے تناظر میں مجاہد کی ایک تالیف ''صفحۂ خاک'' بھی ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی۔ ''صفحۂ خاک'' میں، کچھ ان الفاظ میں مجاہد رقم طراز ہیں۔

> ''بالا کوٹ اب میرے سامنے تھا، پرانی آبادی جہاں کبھی میرا بھی ایک چھوٹا سا گھر تھا، دور سے ایسے دکھائی دی جیسے وہاں کسی نے بلڈوزر چلا دیا ہو۔۔۔آگے پل تھا، اب جو ٹوٹ پھوٹ چکا ہے اور پل کے اس طرف زمین اپنی سطح سے چھ سات فٹ بلند ہو چکی ہے۔''(۲)

''اوک میں آگ'' کی ایک نظم اسی حوالے سے ہے۔جس کا عنوان ''آٹھ اکتوبر 2005ء'' ہے:

پانی تھا میسر، نہ کفن تھا، نہ دعائیں
بے طور ہر اک پیر و جواں دفن کیا تھا

ملبے سے نکالے تھے کئی پھول، کئی خواب
اب یاد نہیں کس کو کہاں دفن کیا تھا (۳)

ہندکو شعری مجموعے ''تُھندے خواب دی چھائی'' کی ایک نظم ''اوہ دہاڑا(اٹھ اکتوبر 2005)'' کا پہلا بند کچھ یوں ہے:

ٹھیر ملبے دا سارے کہار آ ہسے
لوک موتو دا اشتہار آ ہسے
فرنہ سنگی نہ رشتے دار آ ہسے
اوہ دہاڑا نہ فر خدا آنڑیں(۴)

''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں بھی آٹھ اکتوبر کے اس سانحے کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ بالخصوص مجموعے کا آخری حصہ اس حوالے سے کافی مواد لیے ہوئے ہے۔ ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' کی یک شعری نظم ''آٹھ اکتوبر 2005'' ملاحظہ ہو۔

ے چاہے دلی ہو وہ کہ بالاکوٹ
شہر اجڑے تو استعارے ہوئے (۵)

بالاکوٹ کے ایک تباہ شدہ سکول کا نقشہ احمد حسین مجاہد ایسے کھینچتے ہیں:

ے چنے ہیں ملبے سے کتنے کھلے ہوئے بستے
ہمارے ہاتھ میں کوئی ہنر نہیں، نہ سہی (۶)

اس کے علاوہ دو نظمیں ''سفیر احمد لغمانی کی یاد میں'' اور ''شمس الرحمٰن کی یاد میں'' اسی سانحے کا پتہ دیتی ہیں۔ پہلی نظم طویل ہے سو اس کے دو اشعار بذیل ہیں۔

سفیر احمد لغمانی کی یاد میں

(میرا دوست جو آٹھ اکتوبر کے زلزلے میں بچھڑ گیا)

تجھے خبر تھی میں انکار کر نہیں سکتا
تو مجھ سے مانگتا سانسیں ادھار میرے یار
مکان اپنے ہی ملبے تلے دبے ہوئے تھے
نہ شہر تھا نہ کوئی شہر یار میرے یار (۷)

ایک اور عزیز پہ نظم ''شمس الرحمٰن کی یاد میں''، لکھی ملے گی:

شمس الرحمٰن کی یاد میں

خواب دفنانا کوئی آساں نہ تھا
میں نے لیکن یہ گھڑی دیکھی ہوئی ہے
انگلیوں سے میں نے کھودی تھی لحد سی
ناخنوں میں دکھ کی مٹی بھر گئی ہے
اختصارِ داستانِ غم یہی ہے
پہلے وہ تھا اور اب اس کی کمی ہے(۸)

ان دونوں نظموں میں احمد حسین مجاہد نے ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلے کے ذاتی المیے کو شدید جذباتی اور علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔

"سفیر احمد لغمانی کی یاد میں" میں زمین کے زخم اور گرد و غبار کی تصویریں، بچھڑ جانے کی ناقابل یقین کیفیت اور بے بسی کا المیہ اجاگر کرتی ہیں۔ نظم "شمس الرحمٰن کی یاد میں" میں اختصار اور سادگی کے ذریعے غم کی گہرائی ملتی ہے، جہاں قبر کھودنے کا منظر جسمانی تکلیف اور روحانی صدمے کو یکجا کر دیتا ہے۔

دونوں نظموں میں فقدان، یاد داشت، اور قدرتی آفت کے انسانی رشتوں پر پڑنے والے نا قابل تلافی اثرات کو فنی چابک دستی سے سمویا گیا ہے۔

2.2 کشمیر:

ریاست جموں و کشمیر دنیا کے حسین ترین خطوں میں سے ایک ہے۔ اسے دنیا پر جنت بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ حسین لوگ ہوں یا علاقے، رقابتوں کا باعث بنتے ہیں اور اِنھی دشمنیوں کی وجہ سے ظلم کا شکار ہوتے ہیں۔

آزادی کے وقت بھی یہی ہوا۔ پاکستان اور ہندوستان اس خطے کے باعث کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ "کشمیر" ایک کا اٹوٹ انگ اور ایک کی شہ رگ قرار پایا۔ اس آپسی چپکلش نے کتنی ہی ماؤں کے لختِ جگر چھین لیے ہیں۔ دونوں اطراف کے لوگ متاثر ہوئے۔ ابھی تک یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ اقوامِ متحدہ کا ادارہ ہمیشہ کی طرح خاموش تماشائی کی صورت میں موجود رہا اور یہ جنت ارضی نوجوانوں کے خون سے سینچی جاتی رہی۔

احمد حسین مجاہد نے اپنی زندگی کے آٹھ سال کشمیر میں گزارے۔ کشمیر کے حوالے سے ان کی محبت دیدنی ہے۔ آپ نے علم و ادب کی دنیا میں کشمیر اور ہزارہ کے لوگوں میں ایک پل کا کردار ادا کیا ہے، مندرجہ ذیل غزل، کشمیر اور آپ کے تعلق کی نمائندہ غزل ہے:

لہو میں عکسِ درینہ کی جھلمل ڈل سے آتی ہے
ہم اس خوشبو میں رہتے ہیں جو حضرت بل آتی ہے
نکل سکتے ہیں استصوابِ رائے سے کئی رستے
عدو کو موت لیکن مسئلے کے حل سے آتی ہے
مگر اقوامِ عالم کی گراں گوشی نہیں جاتی
لہو کی چاپ ورنہ ہر گزرتے پل سے آتی ہے (۹)

یہ غزل مزاحمتی جذبے، قربانی اور امید کا گہرا امتزاج پیش کر رہی ہے۔ شاعر نے کشمیر کی تاریخی و مذہبی علامتوں، شہادت کے جذبے، اور استصوابِ رائے جیسے سیاسی اشاروں کے ذریعے جدوجہدِ آزادی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس میں اقوامِ

عالم کی بے حسی پر طنز اور امید کا دامن نہ چھوڑنے کی تلقین بھی ہے۔اس کے علاوہ ایک اور شعر جو کشمیری ثقافت اور تمدن کا عکاس ہے ملاحظہ ہو

؎ کانگڑی میں لوبان جلایا، برف میں شکر ڈالی ہے
اڑتی سی اک بات سنی تھی کیا کیا آس لگا لی ہے (۱۰)

آج بھی برف میں شکر ڈال کر کھانا یہاں کے بچوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے اور اسی طرح اڑتی افواہوں اور باتوں پہ امیدیں لگا لینا ہمارے خطے کے افراد کا معاشرتی رویہ ہے۔

2.3 ہجر و وصال:

اردو کی کلاسیکی شاعری اور ہجر و وصال کا مضمون لازم و ملزوم ہیں۔ ہجر سے مراد جدائی اور وصال سے مراد ملاقات کے ہیں۔ یہ موضوع اردو شاعری میں تقریباً ہر شاعر کے ہاں پایا جاتا ہے۔ایک وقت تو ایسا آیا کہ اردو شاعری سے مراد ہجر و وصال کے تجربات کو لیا گیا۔ اردو شاعری کے دو دبستان مشہور ہیں دہلی اور لکھنو۔ایک دبستان کے لوگوں نے ہجر پہ لکھا اور دوسرے وصال کے تذکرہ ضروری سمجھتے تھے۔ مجاہد کے پہلے شعری مجموعوں میں ہجر وصال کے بارے میں ایک محقق نے جو بات کی ہے، وہ یہاں بھی قابل قبول ہے۔

> ''احمد حسین مجاہد کے کلام میں ہجر وصال کے عنوان کو جس طریقے سے برتا گیا ہے۔ وہ نہایت ہی سادہ اور سہل طرز بیان ہے۔ان کے ہاں یہ وہ سچی داستان ہے جو کبھی ختم نہیں ہونے والی۔ کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے بیش تر حالات و واقعات ہجر وصال کے گرد گھومتے ہیں۔(۱۱)

اس حوالے سے ''شہر کے دوسرے کنارے سے''میں بھی مثالیں موجود ہیں۔

؎ یہ رات ہجر کی تم پر بھی آئی ہو گی ضرور
بدل دیے ہیں مگر معنیِ عدم میں نے (۱۲)

ے میں دے رہا ہوں سرہانے کو طول بازو سے
ابھی ترا مرے سینے پہ سر نہیں آیا(۱۳)

ے جنوں میں یار سے آگے قدم نہ پڑ جائے
یہ عمر بھر کی ریاضت بھی کم نہ پڑ جائے(۱۴)

ے گزری ہے جدائی کی بس اک رات
ہم سیدھے تیر ہو گئے ہیں(۱۵)

ے دیکھا ہے کسی نے ہنس کے احمد
ہم کتنے امیر ہو گئے ہیں(۱٦)

ان اشعار میں شاعر نے ہجر کی رات کو محبوب کے احساسات سے جوڑ کر ایک مشترکہ دکھ کو بیان کیا ہے۔ محبوب کی قربت کے لیے بڑھتے ہاتھ، مگر سر نہ آنے کا منظر، وصال کی حسرت کو شدت سے اجاگر کرتا ہے۔ جنون میں یار سے آگے بڑھنے کا اندیشہ اور پوری عمر کی ریاضت کا ذکر، عشق کی راہ میں احتیاط اور انتہا دونوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ جدائی کی ایک رات کو تیر کی سیدھ سے تشبیہ دینا، اور ہنس کر امیر ہونے کا طنز ہجر کے کرب اور خودداری دونوں کو ایک ساتھ پیش کرتا ہے۔

2.4 خودداری:

ادب صرف جذبات کا اظہار نہیں بل کہ فکر و شعور کی بیداری کا ذریعہ بھی ہے۔ ہر دور کا شاعر اپنے زمانے کے مسائل رویوں اور اقدار کو اپنے منفرد تخلیقی اسلوب میں پیش کرتا ہے۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جن کی شاعری میں ایک

مستقل رجحان نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ ایسا ہی ایک نمایاں رجحان خودداری کا ہوتا ہے۔ اردو میں ہمیں اس کی کئی مثالیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں، مثلاً میر تقی میرؔ کا شعر ہے۔

ے سارے عالم میں ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا(۱۷)

غالب کا بھی کچھ ایسا ہی ایک شعر ملاحظہ ہو۔

ے ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور (۱۸)

مذکورہ بالا اشعار میں خودداری اپنی انتہا پر ہے۔ یہ خودداری عام طور پر شعرا کی نفسیات کا حصہ ہوتی ہے۔ کچھ شعرا میں تو اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ انانیت کی سطح پر جا پہنچتی ہے۔ آپ اسے خود نمائی کہہ سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادبا اپنی تخلیق کی ستائش چاہتے ہیں جیسا کہ وہ اپنی اولاد کی ستائش چاہتے ہیں۔ احمد حسین مجاہد کے ہاں بھی خودداری کے نمونے موجود ہیں پر اس طرح کی شدت موجود نہیں بل کہ ایک لطیف سا احساس نمایاں ہے۔ ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں سے چند شعری مثالیں مندرجہ ذیل ہیں۔

ے میں جو کہتا ہوں کچھ نہیں ہو گا
آگ میں ڈال سب کی رائے کو (۱۹)

ے خود آگہی کے شہیدوں میں ہو شمار مرا
اپنی جان سے جاؤں تو راہ میں اپنی(۲۰)

؎ لڑا ہوں اور اکیلا لڑا ہوں اپنے خلاف
کوئی عدو تھا نہ کوئی سپاہ میں اپنی

اسے بھی اپنے کیے پر خوشی ہوئی لیکن
مزا ملا جو مجھے واہ واہ میں اپنی(۲۱)

؎ کہتا ہے ''مت ملے کوئی احمد حسین سے
کم بخت ڈال دیتا ہے زنجیر پاؤں میں''(۲۲)

؎ بہت ہی کم سمجھتے ہیں
مگر جو ہم سمجھتے ہیں(۲۳)

پہلا شعر دیکھیے ایسا لگتا ہے کہ متکلم کسی نوآموز کی حوصلہ افزائی میں مصروف ہے۔ اپنے تجربے کو بنیاد بنا کر کہہ رہا ہے کہ لوگوں کی آرا سے کچھ نہیں ہونے والا کیوں کہ آپ ایک کو راضی کرو گے تو دوسرا خفا ہو جائے گا۔اس لیے اپنا کام جاری رکھو۔ دوسرے شعر میں ایک دبی ہوئی خواہش کا اظہار ہے، خود آگہی کی خواہش۔اگر غور کیا جائے تو کچھ یہ معانی بھی نکلتے ہیں۔'خود آگہی کے شہیدوں' سے ہمارا خیال منصور بن حلاج کی طرف چلا جاتا ہے کہ جنھوں نے خودی کی معراج کو پالیا تھا۔(اقبال نے بھی اسی حوالے سے ان کا تذکرہ اپنے خطبات میں کیا ہے) پھر تفاخر سے کہتے ہیں کہ اپنی راہ میں جاؤں یعنی خودی کو پالوں۔

مجاہد کہتے ہیں کہ لڑا ہوں، کس کے خلاف؟ جواب ہے اپنے نفس کے خلاف اور لڑائی بھی مجھ اکیلے ہی نے کی ہے یعنی میرا کوئی ہم رکاب نہ تھا۔ پھر شعر میں شعرا کی نفسانی خواہش کا ذکر ہے، شعرا اپنی واہ واہی میں وہ لطف محسوس کرتے ہیں کہ باقی تمام خوشیاں اس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہر دوسرا شاعر اپنی قادر الکلامی پر کچھ نہ کچھ کہتا سنائی دیتا ہے۔

اب کی بار احمد تحسین مجاہد اپنی شاعرانہ قدرت کا اظہار کچھ یوں کرواتے ہیں کہ احمد تحسین سے مت ملیے، اگر آپ مل لیے تو پھر راہ فرار نہیں یہ خود پہ ناز کی ایک عمدہ مثال ہے۔ حقیقتاً مجاہد کی شخصیت کچھ ایسی ہی ہے۔ مجاہد کو سقراط کی مانند ادراک ہے کہ وہ کم جانتے ہیں مگر خودی کی انتہا پہ نظر ڈالیں کہتے ہیں کہ مانا ہم کم جانتے ہیں مگر حضور! جیسا ہم جانتے/ سمجھتے ہیں ویسا کوئی اور نہیں سمجھتا۔ مجاہد خود آگاہ اور خود آشنا ہیں۔ ایک بار جو ان کی مجلس میں شامل ہوا تو وہ بار بار آتا ہے۔

2.5 عصری شعور:

ادب صرف معاشرتی حالات کی ترجمانی کا عمل نہیں بل کہ وہ اپنے زمانے کی فکری، فلسفیانہ اور تہذیبی کیفیات کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ جب کوئی ادیب اپنے عہد کے مخصوص مسائل، فکری تبدیلیوں، وجودی سوالات، اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو محسوس کر کے فن میں ڈھالتا ہے، تو وہ عصری شعور کا حامل کہلاتا ہے۔ عصری شعور وہ بصیرت ہے جو ادیب کو ماضی اور حال کے تقابلی تجزیے کے ساتھ مستقبل کی سمتوں کا بھی احساس دلاتی ہے۔

جدید اردو ادب میں عصری شعور کا اظہار خاص طور پر وجودیت، تہذیبی زوال، شناخت کے بحران، اور تقسیم کے صدمے جیسے موضوعات کے ذریعے ہوا۔ عصری شعور ادب کو وقتی تفریح سے نکال کر عہد کی دستاویز میں تبدیل کرتا ہے۔ یہ شعور فن کو اس کے تناظر سے جوڑتا ہے اور قاری کو اس کی موجودہ فکری دنیا سے آشنا کرتا ہے۔ یوں عصری شعور، ادب کو صرف تخلیق نہیں بل کہ تنقید اور تجزیہ کا عمل بنا دیتا ہے۔

احمد تحسین مجاہد کے شعری سرمائے میں سماجی اور عصری شعور کی جھلک بڑی شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔ ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' کی دو نظمیں بہ عنوان ''میں'' اور ''بھونرا'' ملاحظہ ہوں۔

میں

برس دو برس تک
مرا نام ایلان کردی رہا ہے
مگر اب مرے سینکڑوں نام ہیں
میں فلسطین کا مصطفٰی ہوں

پشاور کا گل شیر ہوں

میں نے بڈگام میں جان دی تھی

مری قبر بغداد میں ہے

کہیں میں روہنگیا

کہیں پنڈتوں میں گھرا محض اک آدمی ہوں

پشاور کے اسکول میں

جو عبارت مرے خوں سے لکھی گئی

اس کے معنی کسی پر نہیں کھل سکے

مجھ پہ کابل کی مسجد میں اس وقت حملہ ہوا

جب میں سجدے میں تھا

شام کی سرحدوں پر

مرا قافلہ لٹ گیا

دیکھنے والے بس دیکھتے رہ گئے

راستے بند ہیں

کوئی دروازہ کھلتا نہیں

جس کا اپنا ہی گھر

اس کا مقتل ہو

ظالم زمانے سے بچ کر

زمانے میں آخر کہاں جائے گا

جانتا ہوں

کہ میرا لہو رائیگاں جائے گا(۲۴)

احمد حسین مجاہد کی اس نظم میں عصری شعور پوری شدت سے جلوہ گر ہے۔ شاعر فرد واحد کو علامت بنا کر فلسطین، پشاور، بڈگام، بغداد، روہنگیا اور شام جیسے مقامات کا ذکر کرتا ہے، جو ہمارے عہد کے بڑے المیوں اور سانحات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دہشت گردی، جنگ، جلاوطنی اور مذہبی منافرت کے مناظر نظم میں اس طرح سمٹ آئے ہیں کہ قاری کو عصرِ حاضر کے الم ناک حقائق کا براہِ راست احساس ہوتا ہے۔ شاعر کا یہ بیان کہ ''جس کا اپنا ہی گھر اس کا مقتل ہو'' اور ''جانتا ہوں کہ میرا لہو رائیگاں جائے گا'' ہمارے زمانے کی اس تلخ حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ موجودہ عہد میں انسان کی بقا اور شناخت خطرے سے دوچار ہے۔ یہ نظم عصرِ حاضر کے تشدد اور انسانی المیے کی ایک زندہ شہادت ہے۔ حالاں کہ یہ نظم طویل ہے پہ جب تک پوری نظم کا مطالعہ نہ کر لیا جائے، معانی کی ترسیل میں ابہام رہ جاتا ہے۔ اس حوالے سے مجاہد کی ایک اور نظم ملاحظہ کریں۔

بھونرا

آوارہ اڑنے کی دھن میں

بیٹھے بٹھائے

تاریکی میں

کمرے کے اک کونے سے یہ

اپنی غرض کے سائے سائے

باہر آئے

پر پھیلائے

اندازوں کے تیر چلائے

اڑتا جائے

دائیں بائیں ٹھوکر کھائے

چلتے پنکھے سے ٹکرائے

کوڑے کرکٹ میں مل جائے (۲۵)

بھونرے کی آوارہ اڑان، اندھیرے میں ٹھوکریں کھانااور آخر کار کوڑے کرکٹ میں گم ہو جانا دراصل اس دور کے انسان کی بے سمتی اور مقصد سے عاری جدوجہد کی علامت ہے۔ جدید عہد میں فرد جس بے یقینی، انتشار اور عدم استحکام کا شکار ہے، شاعر نے اسے ایک معمولی حشرے کی علامت سے مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ یوں یہ نظم عصرِ حاضر کے وجودی بحران اور انسانی بے بسی کی عکس بندی کرتی ہے۔ اس کی مثال میں آپ حالیہ عرصے میں چکوال میں رونما ہونے والا ایک واقعہ رکھ سکتے ہیں جب وجودیت سے جونجتے نوجوان (شہیر) نے خودکشی کر لی۔ وجودیت جیسی فکر برصغیر جیسے معاشرے میں خطرناک حد تک بڑھتی جارہی ہے۔ نوجوان اس فکر سے بہ طورِ خاص متاثر دکھائی دیتے ہیں۔

اب ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' کے مندرجہ ذیل اشعار دیکھیے:

ے اس لیے تو مرا رقص والہانہ ہے
کہ یہ گلی نہیں بندوق کا دہانہ ہے(۲۶)

ے چاروں طرف سے خون کے چشمے ابل پڑے
سایہ مرے وجود کے اندر سرک گیا(۲۷)

ے لواخ ہو گئے روشن غزہ کے باغوں میں
کلی کلی پہ نصرت مجھے بلاتی ہے(۲۸)

ے ایجاد ہوئے ہیں ایسے آلات
بوڑھے بھی شریر ہو گئے ہیں(۲۹)

احمد حسین مجاہد کے اشعار میں سماجی اور عصری شعور یکجا دکھائی دیتا ہے۔ بندوق اور خون کے چشموں کے استعارے ''یہ گلی نہیں بندوق کا دہانہ ہے'' اور ''چاروں طرف سے خون کے چشمے ابل پڑے'' عہد کی پر تشدد فضا اور جبر

کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ فلسطین کے پس منظر میں ''لواخ ہو گئے روشن غزہ کے باغوں میں'' عالمی سیاسی شعور کی نمائندگی ہے۔ جدید ایجادات پر مزاح ''ایجاد ہوئے ہیں ایسے آلات ؛بوڑھے بھی شریر ہو گئے ہیں'' مجاہد کے سماج کو دیکھنے کی پرکھ کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ اشعار شاعر کے فن میں عہد اور سماج دونوں کی بازگشت کو نمایاں کرتے ہیں۔

2.6 سماجی شعور:

ادب انسانی تجربات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس میں معاشرتی حقائق کی بازگشت گونجتی ہے۔ جب کوئی تخلیق کار اپنے گرد و پیش کے حالات، طبقاتی کشمکش، استحصالی نظام، اور محروم طبقات کی زندگی سے اثر لیتا ہے، تو اس کے فن میں سماجی شعور کا اظہار ہوتا ہے۔ سماجی شعور ایک ایسا فکری و تخلیقی زاویہ ہے جو ادیب کو معاشرے کی ناہمواریوں، صنفی امتیاز اور دیگر سماجی تضادات سے باخبر کرتا ہے، اور اسے ان کا مؤثر ترجمان بناتا ہے۔

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک اس شعور کی سب سے مربوط اور منظم صورت رہی ہے، جس نے ادب کو محض حسن و جذبات کی ترجمانی کے بجائے ایک انقلابی سماجی آلہ بنایا۔ پریم چند، منٹو، کرشن چندر، اور فیض احمد فیض جیسے ادیبوں نے اپنے فن کے ذریعے معاشرتی ناانصافیوں اور ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کی تحریروں میں وہ اجتماعی دکھ اور اجتماعی آگہی نمایاں ہے جو سماجی شعور کا خاصہ ہے۔ سماجی شعور، محض مسائل کی فہرست نہیں بل کہ انسان دوست فکر کی تشکیل، مزاحمت کی علامت اور بہتر سماج کے خواب کی ادبی صورت گری ہے۔ یہی شعور ایک ادیب کو تاریخ کا فعال کردار بناتا ہے نہ کہ محض تماشائی۔

احمد تحسین مجاہد کی شاعری محض جذبات واحساسات کی تجلی نہیں، اپنے سماج سے جڑی ہوئی ہے۔ ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں شاعر نے فرد کی داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کے مسائل اور تضادات کو بھی اپنی تخلیقی توانائی کا حصہ بنایا ہے۔ اس کے ہاں سماجی شعور محض احتجاجی یا انقلابی نعرہ نہیں بل کہ ایک بصیرت ہے، جو معاشرتی ناہمواریوں، استحصالی رویّوں، محرومیوں اور ناانصافیوں کو اجاگر کرتی ہے۔ شاعر سماج کو ایک متحرک اور متبدل اکائی کے طور پر دیکھتا ہے اور اس کی کاوش یہی ہے کہ قاری کو اپنے عہد کے مسائل سے روشناس کروائے۔ اس تناظر میں احمد تحسین مجاہد کی شاعری نہ صرف فرد کی آواز ہے بل کہ پوری کمیونٹی کی گونج بھی ہے، جس میں انسان کی عظمت، اس کی جد وجہد اور بہتر مستقبل کی آرزو شامل ہے۔

اب مجاہد کی شاعری سے چند مثالیں ملاحظہ کریں۔

ے بزرگ بحث میں الجھے ہوئے ہیں یوں جیسے
اٹھیں گے آج کوئی فیصلہ کر کے(۳۰)

ے اسی لیے تو یہ بستی ہے نامراد بہت
کسی کے کام کوئی وقت پر نہیں آیا(۳۱)

ے ملبوس کر رہے ہیں نمایاں بدن کی آگ
گندم کی خو یہ آ گئی کیسے کپاس میں(۳۲)

ے میں کیا بتاؤں گا تاخیر کا سبب اس کو
لیا نہیں ہے کہیں راستے میں دم میں نے(۳۳)

احمد حسین مجاہد کی شاعری میں سماجی شعور نہایت شدت اور وضاحت کے ساتھ ابھرتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے معاشرتی رویّوں اور اجتماعی کمزوریوں کو طنزیہ اور علامتی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بزرگوں کی محفلیں محض بے نتیجہ بحثوں تک محدود دکھائی دیتی ہیں جہاں فیصلے کبھی عملی صورت اختیار نہیں کرتے اور اگر ایسا ہوتا بھی ہے تو فیصلے غلط ہی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پہ ملک بھر میں کیے گئے قتال کو ہی دیکھ لیجیے تمام خواتین جرگے کے فیصلوں کا شکار ہوئیں۔

اسی طرح وقت کی ناقدری اور وعدہ خلافی کو وہ اس بستی کی ناکامی اور نامرادی کی بڑی وجہ قرار دیتے ہیں۔ شاعر اخلاقی زوال اور معاشرتی بگاڑ پر بھی سوال اٹھاتا ہے کہ کس طرح بدن کی خواہشات اور ہوس پرستی نے سادہ خصلتوں اور پاکیزہ اقدار کو نگل لیا ہے۔ اس شعر کے ایک معنی ایسے بھی ہیں کی جدید سماج نے تحریکِ تانیثیت کو جنم دیا اور عورت سے اس کا وقار چھین کر اسے ایک اشتہار کے طور پہ پیش کروادیا۔ یہاں تک کہ فرد کی روزمرہ زندگی میں تاخیر اور غیر سنجیدگی ایک ایسی کمزوری بن گئی ہے جو اجتماعی رویے کی پہچان بن چکی ہے۔

2.7 مراجعت:

اردو شاعری میں مراجعت ایک ایسا رویہ ہے جس کے ذریعے شاعر اپنے ماضی، یادوں اور تجربات کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہے۔ یہ رجوع محض زمانی یا مکانی سطح پر نہیں ہوتا بل کہ جذباتی اور فکری سطح پر بھی گہرا اثر ڈالتا ہے۔ ماضی کی بازیافت دراصل حال کو سمجھنے اور مستقبل کو بامعنی بنانے کا ایک وسیلہ بنتی ہے۔ اسی لیے مراجعت کا عمل محض یادوں کا بیان نہیں بل کہ ایک تخلیقی اور جمالیاتی تجربہ ہے جو قاری کو گہرے احساس میں ڈبو دیتا ہے۔

احمد حسین مجاہد کے شعری مجموعے ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں یہ رجحان نہایت نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں ماضی کی یادوں کا رنگ، بچھڑے ہوئے لمحات کی بازگشت اور پرانی خوشبوؤں کی سرگوشیاں بار بار ابھرتی ہیں۔ شاعر نے اپنی داخلی کیفیات کو ماضی کی بازیافت کے ذریعے اس طرح سمویا ہے کہ وہ محض سوانحی یادیں نہیں رہتیں بل کہ ایک اجتماعی اور جمالیاتی تجربے میں ڈھل جاتی ہیں۔ یوں یہ مجموعہ مراجعت کے اس رجحان کی بہترین مثال ہے جہاں ذاتی تجربات ایک آفاقی تاثر میں بدل کر قاری کے دل پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ نظم ملاحظہ ہو۔

مراجعت

میں دیکھنے لگا تھا پسِ اعتبارِ جسم
میرا یہ اجتہادِ نظر مجھ کو کھا گیا

بل کھا کے ایک موڑ سے رستہ پلٹ گیا
پہنچے وہاں ہی خاک جہاں کا خمیر ہو(۳۴)

یہ نظم بعنوان ''**مراجعت**'' دراصل ایک داخلی و روحانی جستجو کا استعارہ ہے۔ شاعر جسمانی و زمانی سطح سے آگے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر یہ جستجو اسے آخر کار اپنی اصل کی طرف لوٹا دیتی ہے۔ قرب و وصل سے ماورا کی تلاش، ''زخمِ طلب'' کی مستقل موجودگی اور آخر میں ''رستہ پلٹ جانا'' اس امر کی علامت ہے کہ ہر شعوری یا جمالیاتی سفر بالآخر اپنی ابتدا اور بنیاد یعنی ''خاک و خمیر'' کی مراجعت پر منتج ہوتا ہے۔ اس نظم کی جمالیات اسی وجودی ادراک میں پوشیدہ ہے کہ انسان چاہے کتنا ہی آگے بڑھ جائے، اس کی اصل اور ماخذ ہمیشہ اسے اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

ے ہم بنجارے پریت کے مارے گلیوں گلیوں گھومیں گے
جن کا گھر ہوتا ہے احمد لوٹ کے وہ گھر جاتے ہیں(۳۵)

یہ شعر اپنی تمام تر جمالیات میں یہ پیغام دیتا ہے کہ عشق و تلاش کی تمام سر گردانی کے باوجود مراجعت اپنی اصل اور اپنے مرکز کی طرف لازمی ہے۔

ے گھر کے خالی کمروں میں بھی جن کی کوئی جگہ نہیں
میرے ذمے کچھ ایسی ہی چیزوں کی رکھوالی ہے(۳۶)

ے یہ شامِ شہر تو آلودۂ تصرف ہے
دیارِ دور کی فرصت مجھے بلاتی ہے(۳۷)

ان اشعار میں احمد حسین مجاہد نے مراجعت کے تصور کو علامتی پیکر میں پیش کیا ہے۔ ''گھر کے خالی کمروں'' اور ''چیزوں کی رکھوالی'' کا استعارہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان آخر کار اپنی اصل کی طرف لوٹنے پر مجبور ہے، چاہے وہ اصل ماضی کی یادیں ہوں یا ترک شدہ اقدار۔ اسی طرح ''دیارِ دور کی فرصت'' کا ذکر اس داخلی کشش کی علامت ہے جو انسان کو ہمیشہ اپنی بنیاد، اپنے اصل کی طرف مراجعت پر آمادہ کرتی ہے۔ یوں یہ اشعار انسانی زندگی کے اس ازلی سفر کو نمایاں کرتے ہیں جس کا انجام ہمیشہ اپنی اصل کی طرف لوٹنا ہے۔

2.8 امید:

انسانی زندگی کا سب سے بڑا سہارا امید ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو شدید دکھ، کرب اور محرومی کے باوجود انسان کو شکست تسلیم کرنے نہیں دیتی۔ ادبی تخلیقات میں امید اور رجائیت کو ہمیشہ بنیادی مقام حاصل رہا ہے، کیوں کہ ادب صرف دکھ اور المیے کی ترجمانی نہیں کرتا بل کہ اس دکھ کے پس منظر میں زندگی کی جستجو اور روشنی کی تلاش کو بھی نمایاں

کرتاہے۔ رجائیت دراصل وہ داخلی توانائی ہے جو اندھیروں میں چراغ کی مانند راستہ دکھاتی ہے اور قاری کو یقین دلاتی ہے کہ رائیگانی اور ناامیدی کے باوجود مستقبل میں روشنی اور امکان موجود ہے۔

احمد حسین مجاہد کی کتاب ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں بھی یہی کیفیت نمایاں ہے۔ان کے ہاں اگرچہ زخموں، محرومیوں اور رائیگانی کا ذکر ملتا ہے، لیکن ساتھ ہی مختلف علامات امید کے اس پہلو کو جِلا بخشتی ہیں۔ یوں یہ مجموعہ دکھ اور روشنی، یاسیت اور امید کے امتزاج سے ایک ایسا شعری جہان تعمیر کرتا ہے جو قاری کو تسلسلِ زندگی اور روشن مستقبل پر یقین دلاتا ہے۔

آزار اٹھا کر بھی جلاتے ہیں چراغ
افتاد ہی ایسی ہے کہ بھاتے ہیں چراغ
زخموں سے بجائے خوں، نکلتی ہے لو
اشکوں کی جگہ آنکھ میں آتے ہیں چراغ(۳۸)

وہ سمجھتا ہے اس کنارے کو
پل کی حاجت نہیں ہے سائے کو(۳۹)

نظم ''صاد قینی ٹیڑھ'' کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو جو اسی رنگ میں ہے۔

میں سبھی سے لاتعلق
ممکنہ حد تک خمیدہ دائیں گھٹنے
کے پرانے اور ناہموار گتے پر دھرے
بالشت بھر کاغذ پہ پنسل سے
مسلسل رائیگانی لکھ رہا ہوں
لکھتے لکھتے

انگلیوں میں صاد قینی ٹیڑھ

آنکھوں میں لہو آنے لگا ہے(۴۰)

مزید کچھ مثالیں دیکھیے۔

کوئی آواز پیہم وقت کی اوجھل سے آتی ہے
نویدِ صبحِ نصرت آنے والے کل سے آتی ہے(۴۱)

ضرور آئے گا اس دشتِ تیرگی میں کوئی
سنائی دیتی ہے مجھ کو کسی چراغ کی چاپ(۴۲)

رباعی پر نظر ڈالیں تو شاعر کچھ یوں امید کی شمع روشن کر رہا ہے کہ ہم نے بہت دکھ درد سہے ہیں، اگر رنج اور دکھ درد کی عادت ڈال لی جائے تو وہ رنج نہیں رہتے روزمرہ کے کھیل بن جاتے ہیں، طبع ان سے مائل ہو جاتی ہے۔ شاعر رنج سہہ کر بھی امید کے چراغ جلاتا ہے اور درد کے اندھیروں سے روشنی کشید کرتا ہے۔ کس مپرسی کی حالت میں بھی وہ امید کا دامن چھوڑنے کو تیار نہیں۔

شاعر کو ادراک ہے کہ مسلسل رائیگانی لکھ لکھ کر اس کی انگلیوں میں صاد قینی ٹیڑھ پڑ چکی ہے مگر پھر بھی وہ لکھتا ہے۔ نوجوانوں سے کچھ یوں مخاطب ہے کہ مجھے غیب سے یہ آواز آرہی ہے کہ تمھارا کل روشن ہے۔ آزادی کا شفق پھوٹنے کو ہے، اپنی کوششیں جاری رکھو۔

تیرگی کے صحرا میں چراغ کی چاپ سنائی دینا مستقبل کی روشنی یعنی امید کی علامت ہے۔ مندرجہ بالا اشعار یہ ثابت کرتے ہیں کہ اذیت، ناامیدی اور تنہائی کے باوجود انسان کے شعور میں امید کا دیا ہمیشہ جلتا اور نئی راہیں دکھاتا رہتا ہے۔

یوں دیکھا جائے تو احمد حسین مجاہد کی تخلیقات میں سانحۂ 2005ء کی کربناک یادیں، کشمیر کے دکھوں اور زخموں کی جھلک، ہجر و وصال کی کیفیات، سماجی اور عصری شعور کی باریکیاں، جمالیات کی نزاکتیں، مراجعت کے اشارے اور سب

سے بڑھ کر امید و رجائیت کے پہلو ایک ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ان کی شاعری فرد کے داخلی جذبات تک محدود نہیں رہتی، عہد کے اجتماعی دکھوں، مسائل اور امکانات کی عکاسی بھی کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں دکھ اور مایوسی اپنی تمام تر شدت کے باوجود حتمی کیفیت نہیں ٹھہرتی بل کہ اس کے پس منظر میں ایک نئی صبح، ایک نئی روشنی اور ایک نئے امکان کی کرن موجود رہتی ہے۔ وہ اپنے قاری کو مایوسی کی تاریکی میں بھی امید کا چراغ دکھاتے ہیں، اور یہی چراغ ان کے فن کو دوام عطا کرتا ہے۔ مجاہد کی تخلیقات نہ صرف عہد کی تاریخ اور اجتماعی شعور کا آئینہ ہیں بل کہ یہ اس حقیقت کی بھی گواہ ہیں کہ شاعری جب انسان کے دکھوں اور خوابوں دونوں کو اپنے اندر سمیٹ لے تو وہ محض فن نہیں رہتی بل کہ تہذیبی و فکری ورثے کا حصہ بن جاتی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔سلام سندیلوی،ڈاکٹر،ادب کا تنقیدی مطالعہ،مکتبہ میری لائبریری،لاہور،۱۹۸۶ء،ص ۱۴،۱۵

۲۔احمد حسین مجاہد،صفحۂ خاک،اہتمام پبلیکیشنز، راولپنڈی،۲۰۰۷ء،ص 49،۵۰

۳۔احمد حسین مجاہد،اوک میں آگ،سانجھ پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۴ء،ص ۹۱

۴۔احمد حسین مجاہد،تُھڈے خواب دی چھائی،مثال پبلشرز،فیصل آباد،۲۰۱۸ء،ص ۸۶

۵۔احمد حسین مجاہد،شہر کے دوسرے کنارے سے،کولاج پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۲۵ء،ص ۱۰۷

۶۔احمد حسین مجاہد،شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً،ص ۱۰۸

۷۔احمد حسین مجاہد،شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص ۱۰۹

۸۔احمد حسین مجاہد،شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص ۱۱۰

۹۔احمد حسین مجاہد،شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص ۷۱،۷۲

۱۰۔احمد حسین مجاہد،شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص ۴۱

۱۱۔محمد قدیر،''احمد حسین مجاہد کی شاعری: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ''،تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل اردو،ہزارہ یونی ورسٹی،مانسہرہ،۲۰۲۲ء،ص ۴۶

۱۲۔احمد حسین مجاہد،شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص ۱۶

۱۳۔احمد حسین مجاہد،شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص ۲۱

۱۴۔احمد حسین مجاہد،شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص ۲۷

۱۵۔احمد حسین مجاہد،شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص ۳۱

۱۶۔احمد حسین مجاہد،شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص ۳۲

۱۷۔میر تقی میرؔ،کلیاتِ میرؔ،مرتب: یوسف مثالیؔ،عبداللہ اکیڈمی،اردو بازار،لاہور،۲۰۱۲ء،ص ۹۲۲

۱۸۔مرزا اسداللہ خان غالبؔ،دیوانِ غالب،نواب سنز پبلی کیشنز،راولپنڈی،س۔ن،ص ۳۴

۱۹۔احمد حسین مجاہد،شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص ۱۹

۲۰۔احمد حسین مجاہد،شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص ۶۴

۲۱۔احمد حسین مجاہد،شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص ۶۵

۲۲۔احمد حسین مجاہد،شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص ۹۴

۲۳۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۱۰۵

۲۴۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۶۱، ۶۲

۲۵۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۸۷

۲۶۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۱۰۶

۲۷۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۴۹

۲۸۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۴۶

۲۹۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۳۲

۳۰۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۹۲

۳۱۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۲۲

۳۲۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۱۸

۳۳۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۱۶

۳۴۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۸۵، ۸۶

۳۵۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۱۱۲

۳۶۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۴۲

۳۷۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۴۵

۳۸۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۱۳

۳۹۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۱۹

۴۰۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۳۴

۴۱۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۲۷

۴۲۔احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۹۰

باب سوم:

''شہر کے دوسرے کنارے سے''کا فنی مطالعہ

تمام مخلوقات میں انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے جسے زبان کے ذریعے اظہار و ابلاغ کی صلاحیت حاصل ہے۔ یہی وصف اسے دیگر حیوانات سے ممتاز کرتا ہے۔ اسی لیے اہلِ دانش نے انسان کو حیوانِ ناطق کہا، یعنی ایسا حیوان جو بولنے اور سمجھانے کی قدرت رکھتا ہے۔ ابتدا میں انسانی اظہار اشاروں پر مبنی تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہ صوتی لہجوں اور الفاظ میں ڈھل گیا پھر الفاظ کے ساتھ معانی جوڑے گئے، اور یوں زبان ایک منظم صورت اختیار کرنے لگی۔ زبان کی ترقی کا یہ سفر آخر کار تحریر تک پہنچا جس نے انسانی فکر کو تاریخ کے صفحات پر محفوظ کر دیا۔

یہ زبان کا سفر دراصل انسانی ذہانت، تخیل اور شعور کی ارتقائی منازل کی کہانی ہے۔ سید عابد علی عابد اس موضوع پر لکھتے ہیں:

> ''حیوانِ ناطق نے ذی عقل ہونے کے باوجود فنِ تحریر کی ایجاد اور تہذیب و تکمیل میں کافی دیر لگائی۔ اس بات کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ آج سے قریباً پانچ ہزار سال قبل، پہلے انسانی تحریر کے نمونے وجود میں آ چکے تھے۔ البتہ اس بات پر اختلافِ رائے ہے کہ اس فن کی ایجاد کا سہرا کس قوم کے سر ہے۔ بعض محقق تو وسط ایشیاء کو زبان کا ابتدائی گہوارہ تسلیم کرتے ہیں۔ بعض سعادت کا یہ تاج مصر کے سر پر رکھتے ہیں۔ کچھ مورخ ایسے بھی ہیں جو دجلہ و فرات کے درمیانی میدانوں اور آس پاس کے علاقوں میں اس فن کی ایجاد کے نشانات دیکھتے ہیں۔''(۱)

زبان کی ابتدا اور ارتقا پر گفتگو کرتے ہوئے ارشد محمود ناشادؔ رقم طراز ہیں:

> ''زبان ابتدا میں ایک تھی۔ رفتہ رفتہ انسانی بستیاں دور دور بسنے لگیں تو ہر بستی کے بولنے والے اپنے لیے نئی زبان وضع کرنے لگے اور یوں ایک وقت ایسا آیا کہ مختلف علاقوں اور قبیلوں کی زبانیں جدا جدا ہو گئیں۔''(۲)

یوں زبان کے تنوع نے انسان کو اظہار کے بیش بہا وسائل فراہم کیے۔ لیکن زبان اگر محض خیالات کی ترسیل تک محدود رہتی تو جلد ہی اپنی کشش کھو بیٹھتی۔ انسانی فطرت یک رنگی سے اکتاہٹ محسوس کرتی ہے، لہٰذا اس نے زبان کو محض ابلاغی وسیلہ نہیں رہنے دیا بل کہ اس میں دل کشی، حسن اور اثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہی رجحان آگے چل کر علومِ بلاغت کی تشکیل کا باعث بنا۔

بلاغت دراصل وہ وصف ہے جو کلام کو برمحل، باموقع، اور بامعنی بنا دیتا ہے۔ اس کے تحت یہ دیکھا جاتا ہے کہ کوئی خیال کس انداز میں اور کن لفظی پیکروں میں بیان کیا جا رہا ہے۔ بلاغت نے زبان کو ایک فن کی حیثیت دی اور اہلِ سخن نے محسوس کیا کہ محض سادہ جملے کافی نہیں، بل کہ ان میں تاثیر، دل آویزی اور حسن پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔ اسی ضرورت کے تحت دو بڑے علوم سامنے آئے۔

علمِ بیان اور علمِ بدیع۔

درج ذیل صفحات میں ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں موجود فنی تجربات (علم بیان اور علم بدیع) پر بحث کی جائے گی۔

3.1 علمِ بیان

زبان و ادب کے ارتقائی سفر میں جہاں الفاظ محض خیالات اور جذبات کی ترسیل تک محدود نہ رہے، وہاں ان الفاظ کو دلکش اور اثر انگیز بنانے کی کوشش بھی کی گئی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں زبان محض ابلاغی ضرورت نہیں رہتی بل کہ ایک فن کا روپ دھار لیتی ہے۔ فنِ اظہار کو بامِ کمال تک پہنچانے کے لیے اہلِ فن نے مختلف علوم و فنون وضع کیے۔ انھی میں سے ایک نہایت اہم علم، علمِ بیان ہے جو کلام کی فصاحت و بلاغت کے حسن کو عیاں کرتا ہے اور معانی کی باریکیاں سامنے لاتا ہے۔

علمِ بیان لغوی اعتبار سے "ظاہر کرنے" اور "واضح کرنے" کے معنی دیتا ہے۔ اصطلاحی طور پر یہ وہ علم ہے جس کے ذریعے کسی بات کو مختلف طریقوں سے ادا کیا جائے، تاکہ سامع یا قاری پر معنی کی گہرائی اور حسن زیادہ نمایاں ہو۔ اس علم کا مقصد یہ ہے کہ خیال کو اس انداز سے پیش کیا جائے جو نہ صرف مؤثر ہو بل کہ سامع کے ذہن پر دائمی اثر چھوڑے۔ عربی میں بیان کے معنی وضاحت اور کشف کے ہیں۔

علمِ بیان کی اساس اس بات پر ہے کہ معنی کو کتنے مختلف اور متنوع پیرایوں میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ ایک جملہ سیدھے سادے انداز میں بھی کہا جا سکتا ہے اور اسی جملے کو تشبیہ، استعارہ یا کنایہ کے پیرائے میں بھی ڈھالا جا سکتا ہے۔ یہی تنوع کلام کو محض اطلاعاتی نہیں بل کہ جمالیاتی اور فنی تجربہ بنا دیتا ہے۔ درج ذیل چند اقتباسات میں علم بیان کی مختلف تعریفیں شامل کی گئی ہیں۔

نجم الغنی بحر الفصاحت میں لکھتے ہیں۔

''علم بیان ایسے قاعدوں کا نام ہے کہ اگر کوئی ان کو جانے اور یاد رکھے تو ایک معنی کو کئی طریق سے عبارتِ مختلفہ میں ادا کر سکتا ہے، جن میں سے بعض طریق کی دلالت معنی پر، بعض طریق سے زیادہ واضح ہوتی ہے۔''(۳)

سید عابد علی عابد یوں لکھتے ہیں۔

''علم بیان وہ علم ہے جو مجاز [(1) تشبیہ (2) استعارہ (3) مجاز مرسل (4) کنایہ] سے اس طرح بحث کرتا ہے کہ اس پر حاوی ہونے کے بعد فن کار، انشاپرداز یا خطیب اپنے مفہوم کے ابلاغ میں کامیاب ہو سکے۔''(۴)

احمد تحسین مجاہد نے اپنی تصنیف رموزِ شعر میں کچھ یوں لکھا ہے۔

''یہ وہ علم ہے جس کی مدد سے ہم تشبیہ، استعارہ، مجاز اور کنایہ وغیرہ کے ذریعے ایک ہی معنی کو کئی طریقوں سے ادا کرتے ہیں۔''(۵)

ڈاکٹر صادق نے اپنے ایک مضمون میں علم بیان کی تعریف کچھ یوں کی ہے۔

''علم بیان وہ علم ہے جس کے تحت کسی معنی کو ادا کرنے کے لیے (یعنی معنی پر استدلال لانے کے لیے) نت نئے انداز نکالے جائیں۔ علم بیان ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ کسی بات کو کس طرح مختلف طریقوں سے بیان کیا جائے کہ ایک معنی دوسرے معنی سے زیادہ واضح اور دل کش ہوں یعنی ایک ہی معنی پر دلالت کرنے کے مختلف طریقے کس طرح استعمال کیے جائیں۔ (۶)''

علمِ بیان کی اہم اقسام

علمِ بیان کے ذیل میں مختلف فنون شامل کیے جاتے ہیں جو کلام کو مختلف سطحوں پر حسن بخشتے ہیں۔ان میں نمایاں درج ذیل ہیں:

1. تشبیہ
2. استعارہ
3. مجاز مرسل
4. کنایہ

3.1.1 تشبیہ:

تشبیہ کے لغوی معنی اس بات پر دال ہیں کہ ایک چیز کسی دوسری چیز کے ساتھ ایک معنی میں برابر کی شریک ہے۔علم بیان کی اصطلاح میں تشبیہ اُسے کہتے ہیں کہ کسی ایک چیز کو کسی خاص صفت کے لحاظ سے کسی دوسری چیز سے جس میں وہ صفت مسلمہ طور پر زیادہ ہو، مشابہت دی جائے یا مانند قرار دیا جائے۔اگر دو مختلف چیزوں میں کوئی صفت بالکل یکساں ہو تو اس کی وجہ سے ایک چیز کو دوسرے کے ساتھ تشبیہ نہیں دی جاسکتی یعنی یہ تشبیہ نہیں ہو گی بل کہ تشابہ ہو گا۔

اسی بات کو ڈاکٹر سلیم اختر کی زبان سے کچھ یوں سمجھ سکتے ہیں۔

> ''کسی فرد یا چیز کی منفی یا مثبت خصوصیات واضح کرنے کے لیے اسے زیادہ اچھی یا زیادہ بری، زیادہ خوبصورت یا زیادہ بد صورت، ارفع یا ادنی جیسا قرار دینا۔ جیسے آنکھوں کی خوبصورتی کے لیے آہو چشم کہیں گے لیکن بد نما آنکھوں کو ''گاؤ چشم''قرار دیا جاسکتا ہے۔
>
> مثبت کی وضاحت کے لیے بہتر تشبیہہ جبکہ منفی کا احساس کرانے کے لیے بد تر تشبیہہ استعمال کی جاتی ہے۔خوبیوں اور خامیوں کا تشبیہہ سے فوری طور پر ادراک ہو جاتا ہے۔یوں تفصیلات کی ضرورت نہیں رہتی۔تشبیہہ کو ایک نوع کا شارٹ کٹ سمجھنا چاہیے۔ تشبیہی اسلوب کا زیور ہے۔حسنِ بیان اور طرزِ ادا کو موثر بنانے میں تشبیہہ اساسی کردار ادا کرتی ہے۔بیشتر گالیاں تشبیہہ (اور استعارہ) پر مبنی ہوتی ہیں۔یہ تشبیہ کا منفی استعمال ہے۔''(۷)

ارکان تشبیہ

تشبیہ کے پانچ ارکان ہیں جنھیں اجمالاً درج کیا جارہا ہے۔

مشبہ

جس چیز کو کسی خاص وجہ سے کسی دوسری چیز سے تشبیہ دی جائے اسے مشبہ کہتے ہیں۔

مشبہ بہ

جس چیز کی مانند کسی دوسری چیز کو قرار دیا جائے جیسے جس چیز سے تشبیہ دی جائے اسے مشبہ بہ کہتے ہیں۔

وجہ شبہ

وہ صفت جو مشبہ اور مشبہ بہ میں تعلق پیدا کرنے کا سبب ہو، اسے وجہ شبہ کہا جاتا ہے۔

غرض تشبیہ

مشبہ کی خوبیوں کو وضاحت سے بیان کرنے کے لیے تشبیہ دی جاتی ہے۔ تشبیہ ایک ارادی فعل ہے، اس لیے اس کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔ چناں چہ وہ غرض اور مقصد جس کے لیے تشبیہ دی گئی ہے۔ غرض تشبیہ کہلاتی ہے۔

حرف تشبیہ

حروف تشبیہ میں وہ حروف ہیں جو مشبہ کو مشبہ بہ کے ساتھ ملانے کا واسطہ بنتے ہیں۔

طرفینِ تشبیہ

مشبہ اور مشبہ بہ کو طرفینِ تشبیہ بھی کہتے ہیں۔ طرفین تشبیہ کا ادراک کئی طریقوں سے ہو سکتا ہے۔

تشبیہ کی اقسام

تشبیہ کی کئی اقسام ہیں جن میں سے جو مشہور ہیں، کے نام یہ ہیں۔

تشبیہ قریب، تشبیہ بعید، تشبیہ مفصل، تشبیہ مجمل، تشبیہ مرسل، تشبیہ موکد، تشبیہ تمثیل، تشبیہ مشروط، تشبیہ ملفوف، تشبیہ مفروق، تشبیہ جمع، تشبیہ تسوید، تشبیہ اضمار، تشبیہ مقبول اور تشبیہ مردود وغیرہ۔

تشبیہ کے بغیر نہ صرف شاعری بل کہ نثر بھی اپنی خوب صورتی و دل کشی کھو بیٹھتی ہے۔اس کے ذریعے مجرد اور مشکل مضامین کو سادہ اور عام فہم بنایا جاتا ہے۔ تشبیہ قاری کے تخیل کو بیدار کرتی ہے اور کلام میں ایک جمالیاتی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔

قدیم اردو شاعری سے لے کر آج کے اس جدید دور تک، تشبیہ نے موضوعات کو بیان کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ کلاسیکی شاعری میں زیادہ تر محبوب (عام طور پہ عورت) سے متعلق الفاظ، فطری مناظر، فلکی اجسام، اور رنگ بطور تشبیہ استعمال ہوئے، جب کہ جدید شاعری میں سائنسی اور سماجی حوالہ جات بھی تشبیہی پیکر میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہ فنِ بیان کا سب سے سادہ مگر سب سے مؤثر وسیلہ ہے، جس کے بغیر ادبی اظہار اپنی تمام تر دلکشی اور فنی گہرائی سے محروم ہو جائے۔

احمد حسین مجاہد کی شاعری میں تشبیہ کا استعمال محض فنی تجربہ نہیں بل کہ ایک تخلیقی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ خارجی مناظر اور داخلی کیفیات کے درمیان ایسا رشتہ قائم کرتے ہیں، جو قاری کے لیے مانوس بھی ہو اور دل کش بھی۔ ان کے ہاں تشبیہ روایتی انداز کی پابند نہیں بل کہ یوں کہیے کہ جدید علامتی طرز میں ابھرتی ہے، جس سے کلام میں فکری وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں شاعر محض مظاہرِ فطرت کو بیان نہیں کرتا بل کہ ان میں اپنے داخلی کرب اور احساسات کو شاعری میں منتقل کرتا ہے۔ اس طرح مجاہد کے کلام میں تشبیہ، علامتی جہت بھی پیدا کر دیتی ہے اور شاعر کی داخلی دنیا کا آئینہ بھی بن جاتی ہے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ احمد حسین مجاہد نے ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں تشبیہ کو ایک پل کی مانند برتا ہے، جو خارجی مناظر کو داخلی جذبات سے جوڑتی ہے۔ ان کے ہاں تشبیہ نہ صرف جمالیاتی لذت پیدا کرتی ہے بل کہ قاری کے ذہن میں فکر و احساس کے نئے دریچے بھی وا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تشبیہ محض لفظی صنعت نہیں بل کہ ایک فکری و فنی تجربہ ہے، جو ان کے شعری اسلوب کو منفرد اور مؤثر بناتا ہے۔ بذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎ دھیان کے دیپ کی مدھم لو میں امبر جیسی شکتی ہے
لیکن ایسے شانت سمے ہم خود ہی سے ڈر جاتے ہیں(۸)

ے ہوا کے جیسے ہیں اپنے معاملات سبھی
اب کوئی اپنا اگر ہم سفر نہیں نہ سہی(۹)

ے مثل سراب کرتی ہے موہوم سے ظہور
جلتے ہوئے شجر کا سایہ ہے زندگی(۱۰)

ے مثلِ ہلال ہوں میں افق پر ذرا سی دیر
مجھ سے توقعات زیادہ نہ باندھیے(۱۱)

احمد حسین مجاہد نے زیرِ نظر اشعار میں تشبیہ کا استعمال نہایت فنی نزاکت سے کیا ہے۔ دھیان کے دیپ کی مدھم لو کو امبر کی قوت سے نسبت دے کر شاعر نے یہ دکھایا ہے کہ سکون اور خاموشی بہ ظاہر تو مدھم اور کمزور دکھائی دیتے ہیں، مگر ان میں کائنات جیسی توانائی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسی طرح انسانی معاملات کو ہوا سے تشبیہ دے کر ان کی متلون مزاجی، ناپائیداری اور بکھر جانے کی کیفیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ایک اور مقام پر زندگی کو سراب (دھوکے) اور جلتے ہوئے شجر کے سائے (ناممکن شے) کے مماثل قرار دیا گیا ہے۔ جس سے اس کے دھوکہ دہ ہونے، فریب آمیز ہونے اور اس کے عارضی پن کو واضح کیا گیا ہے۔ شاعر نے اپنی ذات کو ہلال سے مشابہ قرار دے کر اپنی ناپائیداری اور عجز کو نمایاں کیا ہے کہ وہ (انسان) لمحاتی وجود رکھتا ہے اور اس سے کسی بڑی امید یا زیادہ توقعات وابستہ نہیں کی جاسکتیں۔

یہ تمام تشبیہات ظاہر کرتی ہیں کہ شاعر نے خارجی مظاہر سے اخذ کردہ مثالوں کے توسط سے زندگی کے بنیادی حقائق، انسانی کمزوری اور وجود کی ناپائیداری کو فنی اور فکری سطح پر پیش کیا ہے۔ ان تشبیہوں میں نہ صرف جمالیاتی حسن ہے بل کہ ایک گہری معنویت اور علامتی جہت بھی موجود ہے، جو قاری کو محض منظر کے لطف سے آگے بڑھا کر فکر و احساس کی دنیا میں لے جاتی ہے۔

3.1.2 استعارہ:

سادہ لفظوں میں ہم استعارہ کو کچھ یوں کہہ سکتے ہیں کہ جب کوئی لفظ اپنے اصلی یا حقیقی معنی کے بجائے مجازی یا غیر حقیقی معنوں میں استعمال کیا جائے اور حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو اور ایسا قرینہ بھی پایا جائے۔ جس سے ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ لفظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہو رہا ہے، تو یہ استعارہ کہلاتا ہے۔ تشبیہ میں ایک چیز کو دوسری کے مانند ظاہر کرتے ہیں لیکن استعارے میں ہم وہی چیز مستعار لے لیتے ہیں۔ جس کی مانند ہم تشبیہ میں ظاہر کرتے ہیں یا قرار دیتے ہیں۔

استعارہ میں مشبہ یا مشبہ بہ میں سے صرف ایک کا ذکر ہوتا ہے اور جب صرف مشبہ کا ذکر کیا جائے تو مشبہ بہ کے مناسبات کا ذکر لازمی ہو جاتا ہے ورنہ استعارہ نامکمل رہ جائے گا۔ ہماری کلاسیکی شاعری میں دو تین مثالوں کی بہت تکرار ملتی ہے۔ یعنی محبوب کو شمع اور عاشق کو پروانہ قرار دینا یہ دونوں استعارے ہیں۔ کیوں کہ شمع اور پروانہ کا استعمال حقیقی معنوں میں نہیں ہوتا مجازی میں ہوتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق

> ''اچھی شاعری میں استعارے کی کلیدی اہمیت کے بارے میں ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ اس لیے یہ بات بھی ہم سب پر واضح ہے کہ بڑے شاعر کے کلام کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اسی کے یہاں بعض استعارے اور علامتیں یا علامتی استعارے کلیدی اور مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔''(۱۲)

احمد تحسین مجاہد نے رموز شعر میں استعارے پر کچھ یوں بحث کی ہے۔

> ''استعارہ میں لفظ اپنے لغوی معنی سے دست کش ہو جاتا ہے اور اپنے نئے معنی مستعار لے کر ان کی توسیع کر دیتا ہے۔ استعارہ کلام کا جوہر ہے۔ اسی کی وجہ سے کلام میں شدت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو تشبیہ اور استعارہ میں بہت گہری مشابہت ہے۔ فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں ایک چیز کو دوسری کے مانند قرار دیا جاتا ہے جب کہ استعارہ میں مبالغہ سے کام لے کر ایک چیز کو بعینہٖ دوسری چیز قرار دے دیا جاتا ہے۔''(۱۳)

ارکانِ استعارہ

تشبیہ کی طرح استعارہ کے بھی چند ارکان ہیں، جو بذیل ہیں۔

مستعار لہ

جس لفظ کے لیے کوئی معنی ادھار لیے جائیں اسے مستعار لہ کہتے ہیں۔

مستعار منہ

جس شے سے کسی کو تشبیہ دی جائے یا جو چیز مستعار لی جائے، وہ مستعار منہ کہلائے گی۔

وجہ جامع

وہ وجہ جس کی بنا پر کسی شے کو کسی دوسری شے کے مشابہ قرار دیا جائے وجہ جامع کہلاتی ہے۔

جس طرح مشبہ اور مشبہ بہ کو طرفینِ تشبیہ کہتے ہیں، اسی طرح مستعار لہ اور مستعار منہ کو طرفینِ استعارہ کہتے ہیں۔

استعارہ کی اقسام

استعارہ کی بھی کئی اقسام ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

استعارہ اصلیہ، استعارہ مطلقہ، استعارہ مجردہ، استعارہ تمثیلیہ، استعارہ بالکنایہ، استعارہ تخیلیہ اور استعارہ مرشمہ وغیرہ۔

احمد حسین مجاہد کی شاعری میں استعارہ محض اظہار کی خوب صورتی کا کام نہیں کرتا بل کہ فکر و احساس کی ایک معنوی توسیع ہے۔ وہ مجرد تصورات اور داخلی کیفیات کو ایسے پیکروں میں ڈھالتے ہیں، جو قاری کے دل و دماغ دونوں کو بہ یک وقت متوجہ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں استعارہ زندگی کی پیچیدہ حقیقتوں کو گرفت میں لینے کا وسیلہ بھی ہے اور انسانی دکھ، اجتماعی انسانی المیے اور روحانی تجربے کو فن کارانہ سطح پر منتقل کرنے کا ذریعہ بھی۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں استعارے اکثر ایک علامتی نظام کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جو بہ ظاہر سادہ الفاظ کے پردے میں قاری کو کائنات اور وجود کے گہرے مطالب و مفاہیم سے روشناس کراتے ہیں۔ مجاہد کے ہاں استعارہ

داخلی کرب اور امید دونوں کا ترجمان ہے اور اسی کے توسط سے ان کی شاعری معنی آفرینی کی عمدہ مثال ہے۔ اب ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ؔ زمین کا زخم خزانے سے بھر دیا لیکن
زمین کو پھر بھی نہ آیا قرار میرے یار (۱۴)

ماں صحیفہ تھی
صبر و رضا کا صحیفہ
زمیں پر جسے آسماں سے اتارا گیا تھا (۱۵)

ؔ ایک ستارے نے مجھ سے کہا
آپ مجھ سے مخاطب ہیں کیا (۱۶)

ؔ میں دکھ تھا، دست قدرت نے مری تجسیم کر ڈالی
تمہارے درمیان میں شکلِ انسانی میں رہتا ہوں (۱۷)

ؔ ہر نظر کو تھا عجب اک زعمِ تفہیمِ جمال
رہ گئے سب کارواں اس کی جبیں کے آس پاس

کچھ غبارِ وقت میں ہیں کچھ برائے رفتگاں
کیسی کیسی بستیاں ہیں اس زمیں کے آس پاس (۱۸)

ڈوبنے والا تھا جب سوئے مدینہ دیکھا
میں نے ہر موج کے ماتھے پہ پسینہ دیکھا (۱۹)

احمد حسین مجاہد کے ان اشعار اور نظم میں استعارے کی متعدد جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''زمین کا زخم خزانے سے بھر دیا'' میں اپنے مرحوم دوست کو خزانہ کہا ہے، اس کے علاوہ زمین کے دکھ جو دراصل معاشرتی اور انسانی المیوں کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کبھی ختم نہ ہوں گی۔

اسی طرح ''ماں صحیفہ تھی'' کا تصور ماں کو محض ایک رشتے کے طور پر نہیں بل کہ صبر و رضا کے الہامی صحیفے کے طور پر پیش کرتا ہے، جو قربانی اور ایثار کا استعارہ ہے۔ پھر ''میں دکھ تھا، دستِ قدرت نے مری تجسیم کر ڈالی'' میں دکھ کو انسانی شکل میں ظاہر کیا گیا ہے، یہ بھی ایک استعارہ ہے جو انسانی زندگی میں غم کو ایک زندہ وجود کے طور پر پیش کرتا ہے۔ مزید برآں کہ ایک جبیں کو مجسم کر کے کاروان کو اس کے گرد ٹھہرانا لوگوں کو غبارِ وقت کہنا بھی مجاہد کا استعارے کو برتنے کا اپنا انداز ہے۔

آخر میں ڈوبنے والا تھا جب سوئے مدینہ دیکھا میں موج کے ماتھے پر پسینے کا ذکر بھی ایک لطیف استعارہ ہے، جو کرب، خوف اور نجات کے بیچ کی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ شعر نعتیہ پس منظر بھی رکھتا ہے۔ اس طرح یہ اشعار اور نظم محض بیان نہیں بل کہ استعارہ کی زبان میں انسانی جذبات اور کائناتی سچائیوں کو اجاگر کرتے ہیں۔

3.1.3 مجازِ مرسل:

عام طور پر دو باتیں کسی بھی تحریر کے معنی کے بارے میں کہی جاتی ہیں، حقیقی معنی اور مجازی معنی۔ اگر کسی لفظ کو اس کے اصل معنی کے بجائے اس کے مجازی معنوں میں استعمال کیا جائے تو اسے مجاز کہتے ہیں اور اگر اس لفظ کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کے تعلق کے علاوہ کوئی اور تعلق بھی پایا جائے تو یہ تجربہ علم بیان کی اصطلاح میں مجاز مرسل کہلائے گا۔

مجاز مرسل کی کئی صورتیں یا علاقے ہیں۔ جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ جز بول کر کل مراد لینا

۲۔کل بول کر جز مراد لینا

۳۔سبب بول کر مسبب مراد لینا

۴۔مسبب بول کر سبب مراد لینا

۵۔زمانہ سابق تعبیر کرنا

۶۔زمانہ مستقبل سے تعبیر کرنا

۷۔ظرف بول کر مظروف مراد لینا

۸۔مظروف بول کر ظرف مراد لینا

۹۔تضاد کا تعلق

اب ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں موجود مجازِ مرسل کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ نظم ''میں'' کا ٹکڑا بذیل ہے۔

شام کی سرحدوں پر
مرا قافلہ لٹ گیا
دیکھنے والے بس دیکھتے رہ گئے(۲۰)

شعر دیکھیں کہ:

ے کسے خبر تھی کہ میرے وہاں پہنچنے تک
تو اوڑھ لے گا یہ گرد و غبار میرے یار(۲۱)

اب رباعی اور شعر ملاحظہ ہو۔

پیشانیِ گردوں سے زمیں پر آئی
پاتال کے سینے سے ابھر کر آئی
ملنے کو ملی مجھے ہر اک چیز مگر

یوں ہے کہ کشش کھو کے میسر آئی (۲۲)

خواب دفنانا کوئی آساں نہیں تھا
میں نے لیکن یہ گھڑی دیکھی ہوئی ہے(۲۳)

احمد حسین مجاہد کے ہاں ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں ہمیں علم بیان کے دوسرے ارکان کے برعکس مجازِ مرسل کے تجربات کم ملتے ہیں۔ نظم کے ٹکڑے میں دیکھیں تو مجاہد نے شام (ملک) کی سرحدوں یعنی (کل) سرحدوں کہہ کر کسی ایک جگہ کو (جز) مراد لیا ہے۔ پھر دوسرے شعر میں جز کہہ کر کل مراد لی ہے یعنی شعر کا دوسرا مصرع دیکھیے کہ اس میں گرد و غبار کا لفظ کہہ کر زمین مراد لی گئی ہے، یعنی کہ میرا دوست دفن ہو گیا۔

رباعی میں مجاہد نے پہلے مصرعے میں زمین پر آنا کہا(کل کہہ کر جز مراد لی ہے) یہاں ایک خواہش کا نہایت بلندی سے زمین پر، ایک انسانی ذہن میں آنا مراد ہے۔ پھر جب یہ کہا کہ میرے یار خواب دفنانا کوئی آسان نہیں لیکن میں نے یہ گھڑی دیکھی ہوئی ہے یہاں مجاہد کی مراد گھڑی بہ معنی آلہ نہیں بل کہ وقت یا لمحہ ہے۔

3.1.4 کنایہ:

ارشد محمود ناشاد نے اپنی کتاب مبادیاتِ بیان و بدیع و عروض میں لکھتے ہیں کہ:

> ''کنایہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی بات کو چھپا کر کہنا یا بات کو لپیٹ کر بیان کرنا کے ہیں۔ علم بیان کی اصطلاح میں کنایہ اس لفظ یا لفظوں کے مجموعے کو کہتے ہیں جو اپنے حقیقی معنوں کے بجائے مجازی اور مرادی معنوں میں کچھ اس طرح استعمال ہو کہ مجازی معنی حقیقی کہ ملزوم ہوں۔ اس طرح کنائے میں مجازی اور حقیقی دونوں معنی مراد لیے جا سکتے ہیں مگر کلام کرنے والے کی غایت مجازی معنی ہوں۔۔۔اب اگر سننے والا اس سے اصل معنی مراد لے تو غلط نہ ہو گا مگر شاعر کی مراد حقیقی معنوں کے بجائے مجازی یا مرادی معنی ہے۔''(۲۴)

سادہ لفظوں میں کچھ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ جب کوئی لفظ اپنے مجازی معنوں میں استعمال ہو اور اس کے حقیقی معنی بھی مراد لیے جا سکیں تو اسے کنایہ کہتے ہیں۔ مثلاً اگر 'سفید ریش' کہا جائے تو اس سے مراد بڑھاپا ہو گا۔ کنایہ کی چند اقسام یہ ہیں۔ کنایہ قریب، کنایہ بعید، تلویح، رمز، ایما، تعریض، کنایہ اثبات اور کنایہ نفی وغیرہ۔

''شہر کے دوسرے کنارے سے''میں موجود کنایہ کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ے سر پہ اٹھایا میں یونہی آسمان
تم نے بھی آواز نہ دی چھوڑیے(۲۵)

ے اس سے کوئی گلا نہیں احمدؔ، وہ مدد کو اگر نہیں آیا
آسماں بھی نظر نہیں آتا، سر پہ جب بوجھ اٹھایا ہوتا ہے(۲۶)

وہ سمجھتا ہے اس کنائے کو
پل کی حاجت نہیں ہے سائے کو
میں جو کہتا ہوں کچھ نہیں ہو گا
آگ میں ڈال سب کی رائے کو(۲۷)

ے کھل کے دیتا نہیں وہ داد کبھی
آگ لگ جائے اس کی ہائے کو(۲۸)

نظم ''ہائے !افسوس!!''کی چند سطریں دیکھیے۔

سر سے بارِ امانت اترتے ہی
اک سانس اوپر
نہ اک سانس نیچے
میں لوٹ آؤں گا(۲۹)

پہلے شعر میں ''آسمان سر پہ اٹھانا''کنایہ ہے جس کے معنی شور کرنا یا ہنگامہ بپا کرنے کے ہیں۔دوسری مثال میں شاعر نے شکوہ نہ کرنے کی کیفیت بیان کی ہے۔یعنی وہ شخص (یا مدد و معاون قوت)اگر مشکل وقت میں مدد کو نہیں آیا تو

بھی شاعر کے دل میں شکایت نہیں۔ یہاں صبر و رضا اور تقدیر کی قبولیت کا عنصر ہے۔ اس میں ایک طرح کا کنایہ بھی موجود ہے کہ جب بھی وہ کسی مشکل کا شکار ہوتا ہے تو کوئی سامنے نہیں آتا۔

پھر اشعار میں مجاہد پل کی حاجت نہیں ہے سائے کو کہتے ہیں جو کنایہ ہے سہارا اور خود کفالت کا۔ پھر شاعر اپنی ہستی کو اس درجے پر دیکھتا ہے کہا وہ نو تجربہ کاروں کو درس دے سکتا ہے۔ تو کچھ یوں کہتا ہے کہ میری مانو اور سب کی آرا کو آگ میں ڈالنے کا کہتا ہے۔ شاعر کا داد نہ دینے کا ذکر دراصل حسد اور بخلِ محبت کی طرف اشارہ ہے، ہائے اور اس کو لگی آگ دراصل جلن اور حسد کا کنایہ ہیں۔ شاعر اس کنائے کو سمجھنے کی کیفیت بیان کرتا ہے، جو شعوری آگاہی کو ظاہر کرتی ہے۔

آخر میں نظم ''ہائے! افسوس!!'' کے ٹکڑے پہ نظر ڈالیں تو اس میں بارِ امانت کنایہ ہے زندگی کی ذمہ داریوں، مصائب اور انسانی وجود پر عائد اس بوجھ سے جو ہر شخص کو اٹھانا پڑتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جیسے ہی یہ بوجھ اترے گا، یعنی ذمہ داری ختم ہو گی، وہ پلٹ آئے گا۔ سانس اوپر یا نیچے جانے کا ذکر موت اور زیست کی ناپائیداری کا احساس ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی محض دو سانسوں کے درمیان معلق ہے۔

3.2 علمِ بدیع

بدیع کے لغوی معنی نئی چیز، ایجاد، ندرت وغیرہ کے ہیں۔ علم بدیع ایسا علم ہے جس سے کلام کی خوبیاں ظاہر کی جاتی ہیں۔ اس سے آرائشِ کلام کے طریقے معلوم ہوتے ہیں یعنی علم بدیع میں یہ بتایا جاتا ہے کہ بلاغت کے بعد وہ کون کون سے ذرائع اور طریقے ایسے ہوتے ہیں، جن سے کلام میں حسن اور خوبی پیدا کی جاتی ہے یا جا سکتی ہے۔

مختلف ناقدین اور مشاہیرِ ادب نے علم بدیع کی مختلف انداز میں توضیح کی ہے، چند تعریفات بذیل ہیں۔ 'بحر الفصاحت' میں نجم الغنی خاں رقم طراز ہیں۔

> ''بدیع ایک علم یعنی ملکہ ہے جس سے چند امور ایسے معلوم ہو جاتے ہیں جو خوبیِ کلام کا باعث ہوتے ہیں۔ مگر اول اس بات کی رعایت ضرور ہے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو اور اس کی دلالت مقصود پر خوب واضح ہو۔ کیوں کہ ان دونوں خوبیوں کے بعد ہی کلام میں محسنات سے حسن و خوبی آسکتی ہے۔''(۳۰)

شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق:

''اس (علم بدیع) میں الفاظ کے معنوی اور صوری حسن اور ان طریقہ ہائے استعمال کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن کے ذریعے کلام کی معنوی یا ظاہری خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔''(۳۱)

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد رقم طراز ہیں۔

''اصطلاح میں بدیع سے ایسا علم مراد ہے کہ جس سے تحسین و تزئینِ کلام کے اسباب معلوم ہوتے ہیں۔ کلام کا بلیغ اور مقتضائے حال کے موافق ہونا لازم ہے۔ فن کا گہرا شعور علم بدیع کے موثر استعمال کے لیے ناگزیر ہے۔''(۳۲)

سید عابد علی عابد 'البدیع' میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''جس چیز کو بدیع کہتے ہیں وہ دراصل شعری (یہاں شعری مطلوب بحث ہے) تخلیقات کی اقدار حسن کو متعین کرنے اور اظہار حسن کے ابلاغ تام میں معاونت کرنے کا نام ہے۔ اس علم کا منصب یہ ہے کہ لکھنے والے کو اپنی تحریر کی خامیوں کی طرف متوجہ کرے اور کوشش کرے کہ اظہار حسن کے ابلاغِ تام میں معاون ہو''(۳۳)

علمِ بدیع میں جن طریقوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے انھیں صنعت کہتے ہیں جن کی بدولت کلام میں لفظی یا معنوی خوبیاں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ اگر یہ کلام میں نہ بھی ہوں تو کلام کی ذاتی خوبیاں متاثر نہیں ہوتیں۔ جس طرح تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ مل کر کلام کو فصیح و بلیغ اور متنوع بناتے ہیں۔ اسی طرح یہ صنائعِ کلام میں حسن پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ یہ بات بھی زیرِ غور ہے کہ یہ صنائع بدائع اور ارکانِ مجاز تبھی اپنا اثر دکھاتے ہیں، جب قاری عامی نہ ہو بل کہ صاحب ذوق ہو۔ 'رموزِ شعر' میں احمد تحسین مجاہد لکھتے ہیں۔

''یہ حسن اگر الفاظ کے ذریعے پیدا ہوا ہے تو اس کا تعلق ''صنائع لفظی'' سے ہے اور اگر معنی و مفہوم کے ذریعے ہوا ہے تو ''صنائع معنوی'' سے ہے، یعنی اگر درونِ قراتِ شعر قاری کا ذہن شعر کے معنوی محاسن کی طرف جائے تو اس میں ''صنائع معنوی'' اور لفظی خوبیوں کی طرف جائے تو ''صنائع لفظی'' کو بروئے کار لایا گیا ہوگا۔''(۳۴)

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ صنائع دو طرح کی ہوتی ہیں۔ صنائعِ لفظی اور صنائعِ معنوی۔

3.2.1 صنائع لفظی:

اسی صنعتیں جن کا تعلق کلام کے ظاہری پیکر اور صورت سے ہو، انھیں صنائعِ لفظی کہا جاتا ہے۔ ان میں الفاظ کو ایک خاص ترتیب، انداز اور خاص التزام کا پابند کر کے کلام کی خوبصورتی اور دلکشی کو بڑھایا جاتا ہے۔ احمد محسین مجاہد 'رموز شعر' میں رقم طراز ہیں۔

> ''صنائعِ لفظی سے مراد، لفظ کو اس کاری گری اور ہنر کے ساتھ استعمال کرنا ہے کہ اس کی رعایتیں واضح تر ہوں اور کلام کا دیرپا اور خوش گوار تاثر مرتب ہو۔''(۳۵)

''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں احمد محسین مجاہد نے جن صنائعِ لفظی کا تجربہ کیا ہے ان کی تفصیل مندرجہ ذیل صفحات میں ہے، اور وہ صنعتیں کچھ یوں ہیں۔ صنعتِ تجنیس، صنعتِ سیاقۃ الاعداد، صنعتِ تکرار، صنعت تضمین اور صنعتِ ترصیع۔

صنعت تجنیس:

تجنیس کے لغوی معنی ہم جنس ہونا کہ ہیں۔ اس صنعت میں شاعر یا تخلیق کار دو یا دو سے زیادہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو لکھنے میں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان الفاظ کا تلفظ بھی ایک سا ہوتا ہے لیکن وہ معنی کے اعتبار سے الگ الگ ہوتے ہیں۔ ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں صنعتِ تجنیس کے کچھ حوالے یہ ہیں۔

ے سب سے الگ تھلگ میں تماشے میں محو تھا
مجھ سے لپٹ گئے کئی فتنے ہراس میں(۳۶)

اس شعر میں اس شعر میں لفظ 'میں' صنعتِ تجنیس کی علامت ہے۔ ایک 'میں' سے شاعر کی مراد اپنی ذات ہے اور دوسرا 'میں' حرف ہے. اس کے علاوہ ایک غزل میں صنعتِ تجنیس کی مثالیں موجود ہیں، اشعار ملاحظہ ہوں۔

کسی بے انت جذبے کی نگہبانی میں رہتا ہوں
میں جتنا مضطرب ہوتا ہوں آسانی میں رہتا ہوں
وہ میرے ہاتھ کی ریکھاؤں کا حسنِ تغیر ہے
ثبات عشق ہوں میں اس کی پیشانی میں رہتا ہوں (۳۷)

اس غزل میں بھی لفظ 'میں' ہی صنعتِ تجنیس کی علامت ہے۔ایک طرف تو 'میں' سے مراد شاعر کی اپنی ذات ہے اور دوسری طرف 'میں' ایک حرف کی حیثیت سے غزل میں موجود ہے۔اس کے علاوہ ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' کی ایک نظم 'صبر ورضا کا صحیفہ' میں احمد حسین مجاہد نے صنعتِ تجنیس کچھ یوں استعمال کی ہے۔

صبح کاذب نے اپنی سیاہی سمیٹی

محلے کی مسجد سے سحرِ سحر میں

موذن کی آواز کا رس گھلا(۳۸)

نظم کی دوسری سطر میں ایک طرف تو لفظ 'سحر' سے کیفیت ہے اور دوسرا لفظ 'سحر' وقت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

صنعتِ سیاقتہ الاعداد:

جب شاعر کلام میں اعداد یا کسی بھی چیز کی تعداد کا ذکر کرتا ہے تو وہ تجربہ علم بدیع کی اصطلاح میں صنعتِ سیاقتہ الاعداد کہلاتا ہے۔ مثلاً ایک، دو، سو، ہزار اور لاکھ وغیرہ کا ذکر۔

''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں احمد حسین مجاہد نے اس صنعت کا استعمال بھی کیا ہے۔اس کی مثالیں کچھ یوں ہیں۔

ے ایک دو جائیں اگر دو چار آ جاتے ہیں اور
بھیڑ رہتی ہے ترے گوشہ نشیں کے آس پاس (۳۹)

ے آئے تھے ناصح کے سمجھا کر مجھے لے جائیں گے
رہ گئے پھر دشت میں دو چار میرے ساتھ ہی(۴۰)

ے دو قدم بھی نہ ساتھ جس نے دیا
دور تک لے گیا وہی مجھ کو(۴۱)

پہلے شعر میں 'ایک دو' اور 'دو چار' کا ذکر ہے جو صنعتِ سیاقتہ الاعداد کا تجربہ کہلائے گا۔ اگلے شعر میں پھر 'دو چار' کا ذکر ہے اور آخری شہر میں 'دو قدم' کہہ کر 'دو' کا لفظ استعمال کیا ہے جو صنعتِ سیاقتہ الاعداد ہے۔

صنعتِ تکرار:

جب شاعر کلام میں کوئی لفظ یا کلمہ بار بار لاتا ہے تو یہ صنعت، صنعتِ تکرار کہلاتی ہے۔ عام طور پر کلام میں ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جن کی تکرار سے کلام میں حسن و خوبی پیدا ہو جاتی ہے البتہ کچھ شعرا کے کلام میں تکرار خوب صورتی کی بجائے عیب بن جاتا ہے۔ اچھے شعرا کے کلام میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں احمد حسین مجاہد نے صنعتِ تکرار کا استعمال بھی کیا ہے، اشعار ملاحظہ ہوں۔

ے کچھ غبار وقت میں ہیں کچھ برائے رفتگاں
کیسی کیسی بستیاں ہیں اس زمین کے آس پاس(۴۲)

ے یہ شہد و شعر دھرے کے دھرے نہ رہ جائیں
کہیں اسے کوئی کارِ اہم نہ پڑ جائے (۴۳)

ے رات گئی بات گئی چھوڑیے
یہ مری اوقات نہ تھی چھوڑیے (۴۴)

ے میں یہ سمجھا کہ میں ہوں مگر
میں نہیں وہ کوئی اور تھا(۴۵)

پہلے شعر میں لفظ 'کچھ' اور 'کیسی' کا استعمال کر کے یہ صنعت مستعمل ہوئی ہے۔ دوسرے شعر میں 'دھرے' کے استعمال سے صنعتِ تکرار استعمال کی گئی ہے۔ تیسرے شعر میں لفظ 'گئی' کا استعمال ہے اور چوتھے شعر میں لفظ 'میں' کو برتا گیا ہے۔ مزید چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں۔

ے بلا سبب نہیں مڑ مڑ کے دیکھنا میرا
پلٹ کے دیکھ! مجھے دیکھنے کا ڈھب آئے (۴۶)

ے یہ جو مڑ مڑ کے تجھے دیکھ رہا ہوں میں بھی
تجھ میں ایک شخص کوئی بات ہے اچھی خاصی (۴۷)

ے لواخ ہو گئے روشن غزہ کے باغوں میں
کلی کلی پئے نصرت مجھے بلاتی ہے(۴۸)

پہلے دو اشعار میں لفظ 'مڑ مڑ' کی تکرار ہے۔ آخری شعر میں لفظ 'کلی' کو دہرایا گیا ہے، جس سے کلام میں صنعتِ تکرار پیدا ہوتی ہے۔ جس خوبصورتی سے احمد حسین مجاہد نے تکرار کا استعمال کیا ہے وہ ان کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

صنعتِ تضمین:

جب شاعر کسی دوسرے شاعر کے کسی مصرعے سے استفادہ کرتا ہے اور اسے اپنے کلام کا حصہ بناتا ہے تو اس صنعت کو صنعتِ تضمین کہتے ہیں۔ عام طور پر جو مصرع آپ اپنے کلام میں شامل کرتے ہیں، اسے واوین میں رکھا جاتا ہے اور ساتھ ہی حاشیہ میں شاعر کا نام یا تخلص لکھ دیا جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ اسے سرقہ نہ سمجھا جائے۔

احمد حسین مجاہد نے ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' کی نظم بی عنوان 'مراجعت' میں 'مرزا جواں بخت جہاں دار' کا ایک مصرع تضمین کیا ہے۔ اس نظم کا آخری بند یہ ہے۔

کل بھی دکھائی دے جسے عشرِ عشیرِ جزو
وہ کیا کرے جو اپنی نظر کا اسیر ہو

بل کھا کے ایک موڑ سے رستہ پلٹ گیا
"پہنچے وہاں ہی خاک جہاں کا خمیر ہو"(۴۹)

صنعتِ ترصیع:

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کے بہ قول:

"شعرا اکثر ایسی صنعتیں استعمال کی ہیں، جن کے لیے بہت قدرت اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے مگر اس کا تخلیق کو کم فائدہ پہنچتا ہے۔ صنعتِ ترصیع بھی ایک ایسی ہی صنعت ہے اگرچہ اس سے کلام میں خاص طرح کی نغمگیت اور غنائیت پیدا ہوتی ہے مگر اس کے لیے بہت محنت صرف کی جاتی ہے۔ شیر کے دونوں مصرعوں میں جتنے لفظ استعمال ہوں اوپر نیچے ہم وزن ہوں۔"(۵۰)

"شہر کے دوسرے کنارے سے"میں بھی صنعتِ ترصیع کی ایک مثال ہمیں دکھائی دیتی ہے۔

بہت ہی کم سمجھتے ہیں
مگر جو ہم سمجھتے ہیں(۵۱)

اس شعر کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس شعر کے اوپر تلے دونوں مصرعے ہم وزن تو ہیں ہی اور ان کے الفاظ بھی ایک جیسا وزن رکھتے ہیں۔

3.2.2 صنائع معنوی:

کئی ماہرین فن نے صنائعِ معنوی کو صنائعِ لفظی پر فوقیت دی ہے۔ صنائعِ معنوی کو اسی لیے اہمیت دی جاتی ہے کہ شعر کا ظاہری لباس یعنی الفاظ، کتنے ہی خوبصورت ہوں وہ شعر کے مقام و مرتبے کا تعین نہیں کر سکتے۔ صنائعِ معنوی ہی کی وجہ سے معنی کی پیش کش میں ندرت کا ذائقہ شامل ہو جاتا ہے، کیوں کہ اگر صنعت محض تصنع اور بناوٹ کا نمونہ بن جائے تو اس سے ادب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد لکھتے ہیں۔

''صنائع معنوی سے مراد ایسی صنعتیں ہیں جن کے استعمال سے تخلیق میں معنی خیزی، حسن اور پُراسراریت بڑھ جاتی ہے اور اس کے معنی کا دائرہ مزید وسیع ہو جاتا ہے۔''(۵۲)

مندرجہ ذیل صفحات میں ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں موجود ان صنائعِ معنوی کا ذکر کیا گیا ہے جنھیں احمد حسین مجاہد نے برتا ہے۔

صنعتِ تضاد

اگر کلام میں دو الفاظ ایسے لائے جائیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں تو اسے صنعتِ تضاد کہیں گے۔ اس صنعت کو طباق، تطبیق اور مطابقت بھی کہا جاتا ہے۔ صنعت تضاد کی دو اقسام ہیں، تضاد ایجابی اور تضاد سلبی۔

اب ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں صنعتِ تضاد کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ے بتانا پڑ گیا تو کیا بتاؤں گا ان آنکھوں کو
میں کیسی آگ میں جلتا ہوں، کس پانی میں رہتا ہوں(۵۳)

ے وہ حال ہوا ہے ظالموں کا
مظلوم خدا سے ڈر گیا ہے(۵۴)

ے جاگتے ہی پھر وہی سونے سے پہلے کی للک
ایک فتنہ ہو گیا بیدار میرے ساتھ ہی (۵۵)

ے وہی خوشی تو ہمارے دکھوں کی ہے بنیاد
جو ہم نے پائی کسی اور کو خفا کر کے(۵۶)

ے الجھا ہوا دن ہو کہ سلگتی ہوئی شب ہو
جو تیری مشیت ہے وہی میری طلب ہو(۵۷)

ے تم یہاں آ گئے محبت میں، ٹھیک ہے! پھر بھی سوچ لو ایک بار
اس جگہ دھوپ بھی نہیں جاتی جس جگہ میرا سایہ ہوتا ہے(۵۸)

ے وہ جو کڑھتی ہے شب و روز کے ہنگاموں پر
خود بھی اک وجہِ فسادات ہے اچھی خاصی(۵۹)

پہلے شعر میں لفظ 'آگ' اور 'پانی' سے تضاد پیدا کیا گیا ہے۔ دوسرے شعر میں 'ظالم' اور 'مظلوم' کے الفاظ سے صنعت تضاد کا استعمال کیا گیا ہے۔ تیسرے شعر میں 'جاگتے' اور 'سونے' کو برتا گیا ہے جو آپس میں متضاد ہیں۔ چوتھے شعر میں 'خوشی' اور 'دکھ' کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے صنعتِ تضاد ہمیں ملتی ہے۔ پانچویں شعر میں 'دن' اور 'شب' سے صنعت تضاد، چھٹے شعر میں لفظ 'دھوپ' اور 'سایہ' کا استعمال کیا گیا ہے، جو آپس میں متضاد ہیں اور آخری شعر میں پھر 'شب' اور 'روز' کا تذکرہ ہے جس سے صنعت تضاد کا استعمال واضح ہوتا ہے۔

صنعتِ مراعاۃ النظیر

علمِ بدیع کی اصطلاح میں اس سے مراد ہے کہ کلام میں ایک لفظ یا چیز کے متعلق دوسری چیز یا لفظ کا بیان اس طرح کیا جائے کہ وہ اس چیز کے اجزا کی صورت میں سامنے آ جائیں۔ اس طرح کہیں کہ کلام میں ایسے الفاظ یا اشیاء کا ذکر کرنا جن میں کوئی نہ کوئی معنوی تعلق یا رشتہ موجود ہو، یا ان الفاظ میں کوئی نہ کوئی مناسبت ہو، مگر یہ دھیان میں رہے کہ ان الفاظ کا آپسی تعلق تضاد کا نہ ہو یعنی یہ الفاظ آپس میں متضاد نہ ہوں۔ احمد حسین مجاہد نے ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں مندرجہ ذیل اشعار میں صنعت مراعاۃ النظیر کا استعمال کیا ہے۔

ے دیکھے تری نظر کے ہزاروں مسودے
ہم حاشیے میں ہیں نہ کسی اقتباس میں(۶۰)

ے بھڑکتی آگ سے آخر اٹھایا نم میں نے
پھر اس کی لو میں کیا رقص کوئی دم میں نے(۶۱)

ے لے کے دو چسکیاں مرے کپ سے
شہد کر دے گا پھیکی چائے کو(۶۲)

ے وہ مرے ہاتھ کی ریکھاؤں کا حسنِ تغیر ہے
ثباتِ عشق ہوں میں اس کی پیشانی میں رہتا ہوں(۶۳)

ے یہ ترے ہونٹ، یہ رخسار، یہ آنکھیں، یہ جبیں
عرصۂ خواب سے باہر بھی ہے مے خانۂ خواب(۶۴)

ے اپنے بستر پر تھا جب آنکھ کھلی
ہاتھ میں رات کی کلائی تھی(۶۵)

پہلے شعر میں 'مسودے' کی مناسبت سے 'حاشیے' اور 'اقتباس' جیسے الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرے شعر میں 'آگ' کی نسبت سے 'بھڑکنا' اور 'لو'، تیسرے شعر میں 'چائے' سے 'چسکیاں' اور 'کپ'، چوتھے شعر میں 'ہاتھ' کی مناسبت سے 'ریکھائیں' اور 'پیشانی' کا ذکر کیا گیا ہے۔ پانچویں شعر میں ہونٹ، رخسار، آنکھیں اور جبیں، یہ سبھی الفاظ ایک ہی نسبت رکھتے ہیں۔ آخری شعر میں آنکھ، ہاتھ اور کلائی سے صنعتِ مراعاۃ النظیر کا تجربہ کیا گیا ہے۔

صنعتِ حسنِ تعلیل

کسی چیز کے لیے کسی ایسی چیز کو علت فرض کر لینا، جو حقیقت میں اس چیز کی وجہ یا علت نہ ہو، اسے صنعتِ حسن تعلیل کہا جاتا ہے۔ عام طور پر شاعر ایسا کیا کرتے ہیں۔ احمد حسین مجاہد نے ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں بھی صنعتِ حسن تعلیل کا استعمال خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

ے دیکھا ہے کسی نے ہنس کر احمد
ہم کتنے امیر ہو گئے ہیں(۶۶)

ے
تم کسی بات پہ ہنس دیے
اور موسم بدلنے لگا(٦٧)

ے
انھیں معلوم تھا میں فالتو دکھ جمع کر لوں گا
میرے بابا نے گھر میں کوئی الماری نہیں رکھی(٦٨)

ے
بندھی ہے گردشِ افلاک میرے سانسوں سے
یہاں میں اپنے کسی کام سے نہیں آیا (٦٩)

پہلے شہر میں شاعر اپنی امارت کی وجہ اور اگلے شعر میں موسم بدل جانے کی وجہ کسی (محبوب) کا ہنس دینا قرار دیا ہے۔ ظاہر سی بات ہے ایسا حقیقت میں ممکن نہیں۔ پھر گھر میں الماری نہ رکھنے کی وجہ شاعر نے یہ بیان کی ہے کہ میرے بابا کو معلوم ہے کہ میں فالتو دکھ جمع کر لوں گا۔

شاعر نے گردش افلاک کو اپنی سانسوں سے جوڑ دیا ہے اور کہا کہ یہاں (اس جہان میں) میں اپنے کسی کام سے نہیں آیا۔اس شعر میں ہمیں وجودی عنصر بھی دکھائی دیتا ہے۔

صنعتِ مبالغہ

مبالغہ کے لغوی معنی ہیں حد سے بڑھ جانا، شاعر جب کلام میں کسی چیز یا صفت کو اس قدر بڑھا کر بیان کرے کہ حقیقت میں ایسا ہونا ممکن نہ ہو تو اسے مبالغہ کہتے ہیں یعنی ایک ایسی بات کہتے ہیں جو عقل ماننے سے انکاری ہوتی ہے اور جسے آپ استدلال سے ثابت نہیں کر سکتے، صنعتِ مبالغہ کہلائے گی۔

ہمیں شہر کے دوسرے کنارے سے صنعتِ مبالغہ کی چند مثالیں دیکھنے میں ملتی ہیں۔

ے
لے کے دو چسکیاں مرے کپ سے
شہد کر دے گا پھیکی چائے کو(٧٠)

ے ایسے مہکی ہوئی ہے بادِ شمال
تم کہیں جیسے مسکرائے ہو (۷۱)

ے یا تو مٹی ہی بھربھری ہے مری
یا کوئی دکھ ہے واقعی مجھ کو (۷۲)

پہلے شعر میں شاعر نے پھیکی چائے کو شہد کی مانند میٹھا کرنے کا گر بتایا ہے جو شاید اچھا خیال تو ہو سکتا ہے پہ حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ شاعر کا محبوب مسکرا دے تو موسم بدلنے لگتا ہے ماحول معطر ہو جاتا ہے (یہ بات صرف شاعر کے لیے درست ہو سکتی ہے پہ حقیقت سے دور ہے) پھر اس جہان میں شاعر کو دکھ درد اس قدر ملے کہ اسے لگنے لگا کہ واقعی اس کی تخلیق میں دوش ہے حالاں کہ ایسا نہیں یہ محض شاعرانہ خیال ہے۔

صنعتِ تلمیح

صنعتِ تلمیح سے مراد کلام میں ایسے الفاظ لانا، جو کسی خاص واقعہ، تاریخی قصے، شخصیت یا کسی علمی اصطلاح کی طرف اشارہ کریں۔ ملح کا مطلب نمک ہے، جس طرح نمک سے کھانے کا لطف بڑھ جاتا ہے اسی طرح صنعتِ تلمیح کے استعمال سے کلام کی دل کشی اور لطافت میں اضافہ ہوتا ہے۔ احمد حسین مجاہد نے شہر کے دوسرے کنارے سے میں سند تلمیح کا خوبصورت استعمال کیا ہے چند اشعار اور نظمیہ ٹکڑے ملاحظہ کریں:

مجھ کو جو شے پسند آئی تھی
آگ تھی، آگ بھی پرائی تھی

بانٹ دی ہے وہ آگ لوگوں میں
دیوتاؤں سے جو چرائی تھی (۷۳)

ان اشعار میں ایک یونانی اسطور کی طرف ہمیں اشارہ ملتا ہے جس میں حکمرانوں کی آگ کو چرا کر لوگوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔اور ایسا کرنے والے کو سزا بھی ملی تھی۔

اب نظم ''ہائے! افسوس!!'' کا ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

اِس بھرے شہر میں
سارے کردار موجود ہیں
بس نہیں ہے تو کوئی ابوذر نہیں
کیسی روشن کشادہ جبینیں
لیکن کسی پر
کسی دوسرے کے دکھوں کا پسینہ نہیں
یہ مدینہ نہیں (۷۴)

نظم کے اس ٹکڑے میں شہر مدینہ منورہ اور صحابیِ رسول ﷺ حضرت ابوذرؓ کا ذکر کیا گیا ہے۔ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ یہاں بھی لوگ تو ویسی ہی کشادہ جبینیں لیے پھرتے ہیں لیکن وقت آنے پر دغا دے جاتے ہیں دوسروں کے کام نہیں آتے۔پھر نظم 'میں' کے اس حصے کو دیکھیں تو یہ ساری نظم ہی آپ کو صنعتِ تلمیح میں رنگی ملتی ہے۔

برس دو برس تک
مرا نام ایلان کردی رہا ہے
مگر اب مرے سینکڑوں نام ہیں
میں فلسطین کا مصطفیٰ ہوں
پشاور کا گل شیر ہوں
میں نے بڑگام میں جان دی تھی
مری قبر بغداد میں ہے (۷۵)

اس نظم میں احمد حسین مجاہد نے فلسطین، پشاور، گل شیر، بڑگام، بغداد، اے۔ پی۔ ایس کا سانحہ، کابل اور شام کی سرحد کا ذکر کر کے ان سانحات کی طرف دیکھنے کی دعوت دی ہے جن میں معصوموں کی جان چھین لی گئی۔

آخر میں ایک شعری نظم ''آٹھ اکتوبر 2005'' دیکھیے۔

بالا کوٹ کے وہ ہو دلی چاہے
شہر اجڑے تو استعارے ہوئے(۷۶)

اس نظم میں بالا کوٹ شہر کو دہلی کے ساتھ نسبت دی گئی ہے کہ یہ دونوں شہر اجڑے اور پھر امر ہو گئے۔ دہلی کو حکمرانوں کی آپسی چپقلش نے اجاڑا اور بالا کوٹ شہر 2005ء کے زلزلے کی نذر ہو گیا۔

احمد حسین مجاہد کے اس مجموعۂ کلام ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' کے فنی مطالعے سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ شاعر نے اپنے کلام میں علمِ بیان اور علمِ بدیع کو محض تصنع کی حد تک برتا نہیں بل کہ انھیں ایک ہمہ جہت تخلیقی اور فکری تجربے میں ڈھال دیا ہے۔ ان کے ہاں تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجازِ مرسل محض آرائش کے عناصر نہیں بل کہ انسانی کرب، وجودی تجربات اور کائناتی حقائق کی معنی آفرینی کا وسیلہ ہیں۔ اسی طرح صنائعِ لفظی اور صنائعِ معنوی ان کی شاعری کو نہ صرف اظہارِ حسن اور دل آویزی عطا کرتے ہیں بل کہ اس میں فکری گہرائی اور معنوی تنوع بھی پیدا کرتے ہیں۔ یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجاہد کی شاعری میں فنی محاسن اور فکری جہات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر ایک ایسا شعری ڈھانچہ تشکیل دیتے ہیں جو اردو شعری روایت میں ان کے اسلوب کو منفرد اور قابلِ اعتنا بناتا ہے۔

حوالہ جات:

1. سید عابد علی عابد، البیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص۷
2. ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، مبادیاتِ بیان وبدیع وعروض، ورلڈ ویو پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص۱۴
3. نجمی رام پوری، حکیم نجم الغنی خاں، بحر الفصاحت، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، جلد دوم، مارچ ۲۰۰۶ء، ص۹۵۷
4. سید عابد علی عابد، البیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص۴۸
5. احمد تحسین مجاہد، رموزِ شعر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص۹۵
6. ڈاکٹر صادق ''علم بیان''، مشمولہ ''درس بلاغت''، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء، ص۱۸
7. سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2019ء، ص88
8. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، کولاج پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۵ء، ص۱۱۲
9. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۱۰۸
10. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۱۰۵
11. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۱۰۴
12. شمس الرحمٰن فاروقی، شعر، غیر شعر اور نثر، پورب اکادمی، اسلام آباد، 2014ء، 473
13. احمد تحسین مجاہد، رموزِ شعر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص۱۰۷،۱۰۸
14. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۱۰۹
15. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۸۴
16. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۶۳
17. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۳۰
18. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۲۶
19. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۱۰
20. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۶۲
21. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۱۰۹
22. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۱۰۳
23. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۱۱۰
24. ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، مبادیاتِ بیان وبدیع وعروض، ورلڈ ویو پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص۵۵
25. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۴۷

26. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۲۴

27. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۱۹

28. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۲۰

29. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۳۵،۳۶

30. نجمی رام پوری، حکیم نجم الغنی خاں، بحر الفصاحت، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، جلد دوم، مارچ ۲۰۰۶ء، ص۱۱۹۹

31. شمس الرحمٰن فاروقی "بلاغت کیا ہے؟" مشمولہ "درس بلاغت"، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء، ص۱۵،۱۶

32. ارشد محمود ناشادؔ، ڈاکٹر، مبادیاتِ بیان وبدیع وعروض، ورلڈ ویو پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص۶۱

33. سید عابد علی عابد، البدیع، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص۴۱

34. احمد تحسین مجاہد، رموزِ شعر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص۱۱۹

35. احمد تحسین مجاہد، رموزِ شعر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص۱۱۹

36. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۱۸

37. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۲۹، ۳۰

38. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۸۳

39. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۲۶

40. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۶۹

41. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۴۷

42. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۲۶

43. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۲۸

44. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۷۴

45. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۶۴

46. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۵۴

47. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۹۸

48. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۴۶

49. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۸۶

50. ارشد محمود ناشادؔ، ڈاکٹر، مبادیاتِ بیان وبدیع وعروض، ورلڈ ویو پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص۷۰

51. احمد تحسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص۱۰۵

52. ارشد محمود ناشادؔ، ڈاکٹر، مبادیاتِ بیان وبدیع وعروض، ورلڈ ویو پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص۷۷

53. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۲۹

54. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۴۴

55. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۷۰

56. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۹۱

57. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۱۰۶

58. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۲۳

59. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۹۷

60. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۱۷

61. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۱۵

62. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۱۹

63. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۳۰

64. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۷۶

65. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۷۸

66. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۳۲

67. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۶۴

68. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۷۹

69. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۱۰۵

70. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۱۹

71. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۸۸

72. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۷۳

73. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۷۷،۷۸

74. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۳۶

75. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۶۱،۶۲

76. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۱۰۷

باب چہارم:

''شہر کے دوسرے کنارے سے''کا عروضی مطالعہ

4.1 علمِ عروض:

شاعری کی اصل روح تخیل اور جذبے کے ساتھ ساتھ آہنگ اور موسیقیت میں پوشیدہ ہے۔ جب الفاظ ایک خاص وزن میں ڈھل جاتے ہیں تو ان میں وہ کشش پیدا ہوتی ہے جو نثر میں میسر نہیں آتی۔ وزن دو کلموں کی حرکات و سکنات کو کہتے ہیں۔ یہی وزن اور آہنگ شاعری کو فنی حیثیت سے مضبوط بناتا ہے۔

شعر کے لیے مقررہ اوزان میں سے کسی وزن پر پورا اترنے کو کلامِ موزوں کہتے ہیں۔ جو لفظ حروف کی تعداد اور حرکات و سکنات کے لحاظ سے ایک جیسے ہوں تو وہ ہم وزن کہلاتے ہیں۔ حروف اور حرکات میں اختلاف ہو سکتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں لیکن ان کی تعداد برابر ہونی چاہیے۔ شعر کے وزن میں کبھی کبھار غلطی واقع ہو جاتی ہے اس لیے چند قاعدے اور قوانین ایسے وضع کیے گئے ہیں جن سے شعر کا موزوں اور غیر موزوں ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ ان قاعدوں کا نام علمِ عروض ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں مختلف ماہرین عروض نے علم عروض کی جو تعریفیں کی ہیں وہ شامل کی گئی ہیں، ملاحظہ ہو۔

منصف خان سحاب نے 'نگارستان' میں کچھ یوں لکھا ہے۔

> ''عروض ایک فن ہے جس کے ذریعے سے اشعار کے اوزان معلوم کیے جاتے ہیں اور اس سے شعر کی صحت اور سقم کا پتہ چلتا ہے۔''(۱)

احمد حسین مجاہد نے 'رموزِ شعر' میں کچھ یوں کہا ہے کہ :

> ''علمِ عروض ان قواعد کا نام ہے جن کی رو سے شعر کا وزن پرکھا جاتا ہے۔ عروض کا میزان سنار کے میزان جیسا ہے اور اس میں ایک نقطے کی کمی بیشی کا بھی پتہ چلایا جا سکتا ہے۔''(۲)

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کچھ یوں رقم طراز ہیں۔

> ''اصطلاحی مفہوم میں عروض سے مراد وہ علم ہے جس کی مدد سے شعر کی موزونیت یا عدم موزونیت کا پتہ چلتا ہے۔''(۳)

4.1.1 علمِ عروض کا موجد:

علمِ عروض کا موجد ابو عبدالرحمن خلیل بن احمد بصری تھا۔ خلیل بن احمد 100ھ میں بصرہ میں پیدا ہوا۔ شروع ہی سے ادبیات کی طرف راغب تھا۔ بڑا ہو کر علم صرف و نحو اور لغت میں امامِ وقت تسلیم کیا گیا۔ خلیل بن احمد شاعر بھی تھا اچھے شعر کہا کرتا تھا۔ اس نے فن اور ادب پر بہت سی مستقل کتابیں لکھی ہیں، جن میں کتاب العین، کتاب النغم، کتاب الشواہد، کتاب العروض، کتاب العوامل اور کتاب النقط والشکل مشہور ہیں۔ ایک دن خلیل بن احمد کسی قاعدۂ حساب کے بارے میں سوچتا ہوا مسجد میں داخل ہوا۔ مسجد کے ستون سے ٹکرا کر گر پڑا اور گرتے ہی فوت ہو گیا یہ واقعہ 170ھ میں پیش آیا۔

علمِ عروض کی ابتدا کے بارے میں دو روایات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ دھوبی کے کپڑے پیٹنے کی آواز کی لے سے خلیل بن احمد نے اس علم کو ایجاد کیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ خلیل ایک دن ٹھٹھیروں کے بازار سے گزر رہا تھا کہ اتفاقاً ہتھوڑے کی ضرب کی آواز سنائی۔ خلیل کا رجحان موسیقی کی طرف تھا۔ اس لیے ہتھوڑے کی آواز نے اسے اپنی موسیقیت کی وجہ سے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اسے یہ خیال پیدا ہوا کہ جس طرح علم تصریف میں کلمات کے اوزان حروف فا، عین اور لام میں ظاہر کیا جاتے ہیں اسی طرح اس آواز کا بھی کوئی وزن ہونا چاہیے۔ چناں چہ اس نے آواز کو فعلن کے وزن پر تجویز کیا۔ اس کے بعد خلیل بن احمد نے عربی اشعار کی طرف توجہ کی اور مختلف اشعار کے مختلف اوزان تجویز کر کے یہ معلوم کر لیا کہ اشعارِ عرب صرف پندرہ بحور میں کہے جاتے تھے۔

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد لکھتے ہیں۔

> ''یہ روایت مشہور ہے کہ جن دنوں خلیل بن احمد نے اس علم کو مرتب کیا، ان دنوں وہ مکّہ میں تھا۔ مکہ کا ایک پُرانا نام ''عروض'' بھی ہے، اس لیے اُس نے خیر و برکت کے لیے اس نئے علم کا نام بھی عروض رکھ دیا۔''(۴)

4.1.2 بحر:

بحر کا لغوی مطلب سمندر ہے لیکن اصطلاح میں بحر سے مراد وہ وزن ہے جس پر شعر کہا جاتا ہے۔ شعر کے وزن کو بحر اس لیے کہتے ہیں کہ جس طرح دریا سے بہت سی نہریں نکال لی جاتی ہیں، اسی طرح ایک بحر سے کئی زحافات واقع ہو کر الفاظ کو موزوں و مرکب بناتے ہیں۔ بحر کو ترتیب دینے والے الفاظ کو ارکان افاعیل کے کہتے ہیں۔ شروع میں یہ آٹھ

تھے بعد میں دو مزید ارکان کا اضافہ ہو گیا۔ جس سے ان کی تعداد دس ہو گئی اور اسے ''ارکانِ عشرہ'' کہا جانے لگا۔ ان میں دو ارکان پانچ حرفی ہیں اور آٹھ ارکان سات حرفی ہیں۔ یہ ارکانِ افاعیل یہ ہیں۔ فعولن، فاعلن، مفاعیلن، مستفعلن، فاعلاتن، مفاعلتن، متفاعلن، فاع لاتن، مستفع لن، مفعولات۔

ارکانِ افاعیل میں سے ہر رکن چند اجزا پر مشتمل ہوتا ہے۔ پنج حرفی ارکان کے دو اجزا ہوتے ہیں اور سات حرفی کے تین اجزا ہوتے ہیں۔ یہ ارکانِ بحر کہلاتے ہیں۔ انھیں ارکان سہ گانہ بھی کہا جاتا ہے۔

سبب:

سبب کے لغوی معنی رسی کے ہیں۔ دو حرفی کلمے کو کہتے ہیں۔ اس کی دو اقسام ہیں۔ سبب خفیف، اور سبب ثقیل۔

سبب خفیف:

اس دو حرفی کلمہ کو کہتے ہیں، جس کا پہلا حرف متحرک اور دوسرا ساکن ہوتا ہے۔ مثلاً ہم، تم، اس، جب وغیرہ

سبب ثقیل:

اس دو حرفی کلمے کو کہتے ہیں، جس کے دونوں حروف متحرک ہوتے ہیں۔ ایسے کلمے صرف عربی میں ہیں البتہ اردو اور فارسی میں یہ الفاظ ترکیبی صورت میں پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر دلِ من، آبِ حیات وغیرہ۔

وتد:

وتد کے لغوی معنی میخ/کیل کے ہیں تین حرفی کلمہ ہوتا ہے۔ اس کی بھی دو اقسام ہیں، وتد مفروق اور وتد مجموع۔

وتد مجموع:

کسی کلمے کا پہلا اور دوسرا حرف متحرک اور تیسرا ساکن ہو تو اسے وتد مجموع کہتے ہیں۔ جیسے قلم، علم، چمن، وغیرہ

وتد مفروق:

ایسا تین حرفی کلمہ جس کا پہلا اور تیسرا حرف متحرک جب کہ دوسرا ساکن ہو۔ اردو زبان میں ایسا کوئی تین حرفی کلمہ موجود نہیں جو وتد مفروق کی مثال میں پیش کیا جا سکے۔ تاہم تراکیب میں اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ جیسے جانِ عالم، شانِ آدم، دردِ دل، وغیرہ

فاصلہ:

فاصلہ چار یا پانچ حرفی کلمہ ہوتا ہے۔ یہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔ فاصلہ صغری اور فاصلہ کبری۔

فاصلہ صغری:

اس چار حرفی کلمے کو کہتے ہیں جس کے پہلے تین حروف متحرک اور چوتھا ساکن ہو۔ مثلاً نظری، سفری وغیرہ

فاصلہ کبری:

وہ پانچ حرفی کلمہ جس کے پہلے چار حروف متحرک اور پانچواں ساکن ہو۔ اس میں سبب ثقیل اور ایک وتد مجموع ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سفرِ دل، غمِ جہاں، درِ چمن وغیرہ

بحور کی اقسام:

خلیل بن احمد نے مندرجہ بالا ارکانِ افاعیل کی مدد سے پندرہ بحور وضع کی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ عربی اشعار انھی پندرہ بحروں میں کہے جاتے ہیں۔ وہ بحریں یہ ہیں۔ بحر طویل، بحر مدید، بحر بسیط، بحر کامل، بحر وافر، بحر ہزج، بحر رمل، بحر رجز، بحر مضارع، بحر منسرح، بحر سریع، بحر خفیف، بحر مجتث، بحر مقتضب اور بحر متقارب۔

ان بحروں پر ابو الحسن اخفش نے ایک بحر یعنی بحر متدارک کا اضافہ کیا، بعد میں ایران والوں نے اپنے لیے تین مزید بحریں یعنی بحر جدید، بحر قریب اور بحر مشاکل کو وضع کر لیا۔ گویا کل انیس بحریں وجود میں آ گئیں۔ جن میں سے بحر مدید، بحر بسیط، بحر وافر، اور بحر مشاکل اردو میں مستعمل نہیں ہیں۔ بہ غور مطالعہ کرنے سے پتہ چلے گا کہ بعض بحور ایک ہی رکن کی تکرار سے حاصل کی گئی ہیں، اسی لیے انھیں یک رکنی بحریں یا مفرد بحریں کہا جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں۔ بحر کامل، بحرے وافر، بحر ہزج، بحر رمل، بحر رجز، بحر متقارب اور بحرے متدارک۔

اس کے برعکس بعض بحریں دو رکنوں کی ترکیب سے وجود میں آتی ہیں۔ انھیں مرکب بحریں کہا جاتا ہے۔ یہ ہیں۔ بحر طویل، بحر مدید، بحر بسیط، بحر مضارع، بحر منسرح، بحر سریع، بحر خفیف، بحر مجتث، بحر مقتضب، بحر جدید، بحر قریب اور بحر مشاکل۔ ارکان کی تعداد کے لحاظ سے آٹھ ارکان والی بحریں مثمن، چھے ارکان والی مسدس اور چار ارکان والی بحور کو مربع کہتے ہیں۔

4.2 تقطیع:

تقطیع کے لغوی معنی کسی چیز کے ٹکڑے کرنا ہیں۔ علم عروض کی اصطلاح میں شعر کے ارکان کو اوزان کے ساتھ برابر کرنے کو تقطیع کہتے ہیں یعنی شعر کے متحرک حروف بحر کے متحرک رکن کے متحرک حروف کے برابر آئیں گے اور ساکن حروف رکن کے ساکن حروف کے برابر آئیں گے اگر کسی شعر میں استعمال کیے ہوئے حروف کی حرکات اور سکون اجزائے بحر کے حرکات اور سکون کے مطابق ہوں، تو وہ مستحسن مانے جاتے ہیں لیکن اگر زیر کے مقابلے زیر اور پیش کے مقابلے پیش نہ آئے تو کسی خاص قید کی پابندی نہیں ہوتی۔ صرف متحرک کی جگہ متحرک لانا ضروری ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں تقطیع کے اصولوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

آ:

دو الف کے برابر ہو گا۔

الف:

دو الف ساتھ آئیں تو ایک گر جاتا ہے۔ اب اس کی جگہ ابس ہو گا۔ عربی کے الفاظ جن میں الف لام درمیان میں ہوں تو الف گر جائے گا۔ بالکل کی جگہ بالکل ہو گا۔ عربی النسل الفاظ کے آخر میں الف گر جاتا ہے 'لا تقطنوا' کا الف گر جائے گا۔ اگر الف درمیان میں ہو اور اس سے پہلے والا حرف متحرک ہو تو یہ گر جاتا ہے۔ تیر انداز سے تیر نداز

ن:

نون غنہ گر جائے گی۔ مثلاً جہاں سے جہا۔ نون غنہ سے پہلے کوئی حرف علت ہو تو وہ بھی گر جاتا ہے۔ چلتا ہوں کی جگہ چلتاہ۔

و:

واؤ معدولہ شمار نہیں ہو گی۔ خوش کی جگہ خش آئے گا۔ واؤ ضمہ یعنی پیش میں بدل جائے گی۔ مثلاً خود سے خُد۔ اور کا واؤ بھی گر جائے گا ار پڑھا جائے گا۔

ہ:

ہائے مخلوط شمار نہیں ہو گی بھ پھ کی جگہ ب پ کی آواز ہو گی۔ 'ہ' لفظ کے آخر میں ہو تو شمار نہیں ہو گی کہ اور چہ کی جگہ ک اور چ پڑھا جائے گا۔

سہ حرفی الفاظ جن کے آخر میں 'ہ' ہو وہ دو حرفی تصور ہوں گے ہمہ کی جگہ ہم اور رسہ کی جگہ رس پڑھا جائے گا۔

ء،ع:

ہمزہ یا عین کبھی نہیں گرتے بہ شرط یہ کہ اگر عین ساکن ہو اور اس سے پہلا حرف بھی ساکن ہو تو دو ساکن ہونے کی وجہ سے گر جائے گی۔

داؤد میں ہمزہ نہیں گرے گی بل کہ ایک حرف شمار ہو گی۔

ی:

ہندی لفظ کے آخر میں ہو تو گر جائے گی۔ فارسی میں نہیں گرے گی۔ درمیان میں ہو تو دب جائے گی کیا کیوں کا وزن کا کو ہو گا۔ پیار کو پار اور دھیان کو دان شمار کریں گے۔ عربی فارسی الفاظ کے آخر میں نہیں گرے گی میں اور ہیں میں نون غنہ کے علاوہ یہ بھی شمار نہیں ہو گی۔ 'م' اور 'ہ' شمار ہو گا۔

کھڑا زبر:

الف کے برابر شمار ہو گا۔

زیر:

فارسی تراکیب میں زیر حرف تصور ہو گی۔

تنوین:

تنوین نون کے برابر شمار کی جائے گی۔ قصداً کی جگہ قصدن ہو گا۔

ساکن:

دو ساکن ایک ساتھ آ جائیں تو ایک متحرک ہو جائے گا۔ تین ساکن ایک ساتھ آ جائیں تو دو قائم رہیں گے، تیسرا گر جائے گا

تشدید:

جس حرف پر تشدید ہو گی، وہ حرف دو حروف کے برابر شمار ہو گا۔ مثلاً محبت 'محب' اور 'بت' ہو گا۔

4.3 ''شہر کے دوسرے کنارے سے ''میں مختلف بحور کے تجربات

احمد حسین مجاہد اردو کے معاصر شعرا میں اپنے اسلوب کے باعث منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں جہاں فکری تنوع اور عصری حسیت ملتی ہے وہیں فنی سطح پر بھی ان کی کاوشیں خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' نہ صرف موضوعات کے اعتبار سے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے بل کہ عروضی پہلو سے بھی نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ اس مجموعے میں بائیس (۲2) نظمیں، اڑتیس (38) غزلیں اور چودہ (14) متفرق اشعار شامل ہیں۔ اس مجموعے میں انھوں نے اکیس (۲۱) اوزان میں تجربات کیے ہیں جن میں سے دو رباعیات ہیں اور انیس (۱۹) اوزان کے تجربات بقیہ غزلیات، منظومات اور اشعار میں کیے ہیں۔

شاعری کی ساخت میں آہنگ اور وزن بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی آہنگ کسی بھی تخلیق کو موسیقیت عطا کرتا ہے اور قاری یا سامع پر دیرپا تاثر قائم کرتا ہے۔ علمِ عروض دراصل وہ علمی و فنی ذریعہ ہے جس کے ذریعے شعری آہنگ کو سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اردو شاعری میں یہ علم عربی اور فارسی کی روایت سے ماخوذ ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں ارتقائی جہتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ کسی بھی شعری مجموعے کا عروضی مطالعہ محض بحور کے تعین تک محدود نہیں رہتا بل کہ یہ شاعر کے فنی شعور، بحور کے انتخاب میں اس کی ترجیحات اور مختلف اوزان کے حامل پیکروں میں اظہار کی صلاحیت کا بھی سراغ دیتا ہے۔

''شہر کے دوسرے کنارے سے'' کا عروضی مطالعہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس مجموعے میں مجاہد نے ایک طرف اردو غزل کی کلاسیکی روایت سے تعلق بحال رکھا ہے اور دوسری طرف آزاد نظم اور جدید شعری رویوں کے ساتھ بھی رشتہ قائم کر رکھا ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' کا عروضی مطالعہ پیش کیا جائے گا

تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ شاعر نے مختلف بحور کے استعمال سے کس طرح اپنی شاعری کو فنی تنوع اور صوتی حسن بخشا ہے۔
احمد تحسین مجاہد نے جن دو رباعیات کو شامل کیا ہے وہ یہ ہیں:۔

آزار اٹھا کر بھی جلاتے ہیں چراغ
افتاد ہی ایسی ہے کہ بھاتے ہیں چراغ
زخموں سے بجائے خوں، نکلتی ہے لو
اشکوں کی جگہ آنکھ میں آتے ہیں چراغ(۵)

پیشانیِ گردوں سے زمیں پر آئی
پاتال کے سینے سے ابھر کر آئی
ملنے کو ملی مجھے ہر اک چیز مگر
یوں ہے کے کشش کھو کہ میسر آئی (٦)

اب تمام منظومات (غزلیات اور نظمیں) سوائے اشعار کے مع بحور کے، بذیل سطور میں درج ہیں۔

عالیہ احمد کے نام

بحر ہزج مفاعی لن

اے میرے پروردگار

منسرح مربع مطوی مکسوف/مقصور مفتعلن، فاعلن/فاعلان

ع گناہگار ہوں دہلیز پر بٹھا دیجے (۹۹)

مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

تری آنکھیں

ہزج مفاعی لن

ع بھڑکتی آگ سے اٹھایا آخر اٹھایا نم میں نے(۷)

مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع ہر شے ہے کائنات کی اس کے لباس میں(۸)

مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف مفعول، فاعلات، مفاعیل، فاعلن

ع جو دل میں ہے وہ لبِ چشمِ تر نہیں آیا(۹)

مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع مجھ کو جلتے شجر کے سائے میں، جب بھی اس نے بلایا ہوتا ہے(۱۰)

خفیف مسدس مخبون محذوف/مسکن مضاعف فاعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع میری وحشت جگمگائے گی زمیں کے آس پاس(۱۱)

رمل مثمن محذوف/مقصور فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن/فاعلان

ع جنوں میں یار سے آگے قدم نہ پڑ جائے(۱۲)

مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع کسی بے انت جذبے کی نگہبانی میں رہتا ہوں(۱۳)

ہزج مثمن سالم مفاعی لن، مفاعی لن، مفاعی لن، مفاعی لن

ع اپنے ہی اسیر ہو گئے ہیں(۱۴)

ہزج مسدس اخرب مقبوض/مقصور مفعول، مفاعلن، فعولن

صادقینی ڈیڑھ

بحر ہزج مفاعی لن

ہائے !افسوس!!

متقارب فعولن، فعولن، فعولن

مسافر خواہشیں

بحر رمل　　　فاعلاتن، فاعلاتن

دست برداری کا لمحہ

متقارب　　　فعولن، فعولن، فعولن

ع　　　دل کسی اور ہی امکان پہ آیا ہوا ہے (۱۵)

رمل مخبون محذوف/ مقصور　　　فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن

ع　　　کانگڑی میں لوبان جلایا، برف میں شکر ڈالی ہے (۱۶)

بحرِ میر (ہندی بحر)　　　فعلن، فعلن

ع　　　خوشبو کی طرح گزر گیا ہے (۱۷)

ہزج مسدس اخرب مقبوض/ مقصور　مفعول، مفاعلن، فعولن

ع　　　ترے لبوں کی حلاوت مجھے بلاتی ہے (۱۸)

مجتث مثمن مخبون محذوف/ مقصور　　مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع　　　رات گئی بات گئی چھوڑیے (۱۹)

سریع مسدس مطوی مکسوف/ موقوف　　　مفتعلن، مفتعلن، فاعلن

ع　　　مٹی کا اک غبار جو سوئے فلک گیا (۲۰)

مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف　مفعول، فاعلات، مفاعیل، فاعلن

ع　　　حرفِ جاں سوز ہے پیرائے تشہیر نہیں (۲۱)

رمل مخبون محذوف/ مقصور　　　فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن

ع　　　پسِ وصال ٹھکانے حواس جب آئے (۲۲)

مجتث مثمن مخبون محذوف/ مقصور　　مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع   سر ہی تھا غم خم ہوا اور خم ہی رہ گیا(۲۳)

مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف   مفعول، فاعلات، مفاعیل، فاعلن

فبای آلاء ربکما تکذبان

رمل   فاعلاتن، فاعلاتن

ایک لامحدود

ہزج   مفاعی لن

اس بستی کے مکھیا

رجز   مستفعلن، مستفعلن

میں

متقارب   فعولن، فعولن

ع   اک ستارے نے مجھ سے کہا(۲۴)

متدارک مسدس سالم   فاعلن، فاعلن، فاعلن

ع   جچا نہ کوئی بھی منصب نگاہ میں اپنی(۲۵)

مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور   مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع   برف پر آگ جلاتا ہوں، الجھ جاتا ہوں(۲۶)

رمل مخبون محذوف/مقصور   فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن

ع   جائے گا یہ روگ یہ آزار میرے ساتھ ہی(۲۷)

رمل مثمن محذوف/مقصور   فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن/فاعلان

ع   لہو میں عکسِ دیرینہ کی جھلمل ڈل سے آتی ہے(۲۸)

ہزج مثمن سالم   مفاعی لن، مفاعی لن، مفاعی لن، مفاعی لن

ع بت سمجھنے لگے سبھی مجھ کو(۲۹)

خفیف مسدس مخبون محذوف/مسکن فاعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع اب میں دیوانۂ دنیا ہوں نہ دیوانۂ خواب(۳۰)

رمل مخبون محذوف/مقصور فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن

ع مجھ کو جو شے پسند آئی تھی(۳۱)

خفیف مسدس مخبون محذوف/مسکن فاعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع سخن میں ہم نے دور از کار پرکاری نہیں رکھی(۳۲)

ہزج مثمن سالم مفاعی لن، مفاعی لن، مفاعی لن، مفاعی لن

زمینی بلائیں

متقارب فعولن، فعولن

صبر ورضا کا صحیفہ

متدارک فاعلن، فاعلن

بھونرا

ہندی بحر فعلن، فعلن

ع ایسے مہکی ہوئی ہے بادِ شمال(۳۳)

خفیف مسدس مخبون محذوف/مسکن فاعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع خجل ہے صرفِ نظر سے بہارِ باغ کی چاپ(۳۴)

مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع بڑھا کے ربط مجھے خاک سے دیا کر کے(۳۵)

مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع کچھ دن سے اک عجیب سی ہلچل ہے گاؤں میں (۳۶)

مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف مفعول، فاعلات، مفاعیل، فاعلن

ع سب ختم ہو گیا مری وحشت نہیں گئی (۳۷)

مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف مفعول، فاعلات، مفاعیل، فاعلن

ع نظمِ فطرت میں مساوات ہے اچھی خاصی (۳۸)

رمل مخبون محذوف/مقصور فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن

ع ہر قدم پر گم شدہ یادوں کا ویرانہ پڑے (۳۹)

رمل مثمن محذوف/مقصور فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن/فاعلان

ع ایک دریائے نہاں تھا اب نہیں ہوں (۴۰)

رمل مسدس سالم فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن

ع اس رت میں ہے ہوا بھی سفر سے گریز پا (۴۱)

مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف مفعول، فاعلات، مفاعیل، فاعلن

آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵

خفیف مسدس مخبون محذوف/مسکن فاعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع بہت ہے فرشِ زمیں، بام و در نہیں نہ سہی (۴۲)

مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

سفیر احمد لغمانی کے لیے

مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

شمس الرحمن کی یاد میں

رمل مسدس سالم فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن

ع کہیں چراغ کہیں خواب چھوڑ آیا ہوں (۴۳)

مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع سانجھ سے جب سب آشائیں، سب سپنے مر جاتے ہیں (۴۴)

بحرِ میر (ہندی بحر) فعلن، فعلن

ع وہ سمجھتا ہے اس کنائے کو (۴۵)

خفیف مسدس مخبون محذوف/مسکن فاعلاتن، مفاعلن، فعلن

اب اشعار ملاحظہ ہوں جو مجاہد نے جہانِ دیگر کے عنوان کے ذیل میں شامل کیے ہیں:۔

ع ڈوبنے والا تھا جب سوئے مدینہ دیکھا (۴۶)

رمل مخبون محذوف/مقصور فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن

ع بہت ہی کم سمجھتے ہیں (۴۷)

ہزج مربع سالم مفاعی لن، مفاعی لن

ع منصب اگرچہ یہ میرے قد سے بلند ہے (۴۸)

مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف مفعول، فاعلات، مفاعیل، فاعلن

ع مجھ کو کتنے غموں نے گھیرا ہے (۴۹)

خفیف مسدس مخبون محذوف/مسکن فاعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع بس اک ہجوم ہے پنجوں پر ایستادہ ہجوم (۵۰)

مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع مثلِ سراب کرتی ہے موہوم سے ظہور (۵۱)

مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف مفعول، فاعلات، مفاعیل، فاعلن

ع بندھی ہے گردشِ افلاک میرے سانسوں سے (۵۲)

مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع سب قاصدوں کو پھیر دیا تو نے خالی ہاتھ (۵۳)

مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف مفعول، فاعلات، مفاعیل، فاعلن

ع تو کیا یہ سچ ہے کہ ان قافلوں میں ہم بھی تھے (۵۴)

مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع اسی لیے تو مرا رقص والہانہ ہے (۵۵)

مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع روشنی مجھ تک میری محدود ہو کر رہ گئی (۵٦)

رمل مثمن محذوف/مقصور فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن

ع الجھا ہوا دن ہو کے سلگتی ہوئی شب ہو (۵۷)

ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعولن

ع میں ان کا سہارا ہوں جنھیں دشتِ بلا میں (۵۸)

ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعولن

ع کوئی بھروسہ نہیں، میرا کوئی ٹھیک نہیں (۵۹)

مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

4.4 گوشوارہ:

بذیل سطور میں وہ گوشوارہ درج ہے جس کے مطابق یہ واضح کیا گیا ہے کہ احمد حسین مجاہد ''شہر کے دوسرے کنارے سے''میں کون کون سے اوزان سترہ(۱۷)(اپنی غزلوں اور نظموں میں) کتنی بار استعمال میں لائے ہیں۔

۱۔ہزج مثمن سالم

مفاعی لن، مفاعی لن، مفاعی لن، مفاعی لن

ع کسی بے انت جذبے کی نگہبانی میں رہتا ہوں(۶۰)

ع لہو میں عکسِ دیرینہ کی جھلمل ڈل سے آتی ہے(۶۱)

ع سخن میں ہم نے دور از کار پرکاری نہیں رکھی(۶۲)

عالیہ احمد کے نام **تری آنکھیں** **صادقینی ٹیڑھ** **ایک لامحدود**

۲۔ منسرح مربع مطوی مکسوف/مقصور

مفتعلن، فاعلن/فاعلان

اے مرے پروردگار

۳۔ مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور

مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع گناہگار ہوں دہلیز پر بٹھا دیجے(۶۳)

ع بھڑکتی آگ سے اٹھایا آخر اٹھایا نم میں نے(۶۴)

ع جو دل میں ہے وہ لبِ چشمِ تر نہیں آیا(۶۵)

ع جنوں میں یار سے آگے قدم نہ پڑ جائے(۶۶)

ع	ترے لبوں کی حلاوت مجھے بلاتی ہے(۶۷)

ع	پسِ وصال ٹھکانے حواس جب آئے(۶۸)

ع	جچا نہ کوئی بھی منصب نگاہ میں اپنی(۶۹)

ع	خجل ہے صرفِ نظر سے بہارِ باغ کی چاپ(۷۰)

ع	بڑھا کے ربط مجھے خاک سے دیا کر کے(۷۱)

ع	بہت ہے فرشِ زمیں، بام و در نہیں نہ سہی(۷۲)

سفیر احمد لغمانی کے لیے

۴۔مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف

مفعول، فاعلات، مفاعیل، فاعلن

ع	ہر شے ہے کائنات کی اس کے لباس میں(۷۳)

ع	مٹی کا اک غبار جو سوئے فلک گیا(۷۴)

ع	سر ہی تھا غم خم ہوا اور خم ہی رہ گیا(۷۵)

ع	کچھ دن سے اک عجیب سی ہلچل ہے گاؤں میں(۷۶)

ع	سب ختم ہو گیا مری وحشت نہیں گئی(۷۷)

ع	اس رت میں ہے ہوا بھی سفر سے گریز پا(۷۸)

(قطعہ)

۵۔خفیف مسدس مخبون محذوف/مسکن

فاعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع وہ سمجھتا ہے اس کنائے کو(۷۹)

ع بت سمجھنے لگے سبھی مجھ کو(۸۰)

ع مجھ کو جو شے پسند آئی تھی(۸۱)

ع ایسے مہکی ہوئی ہے بادِ شمال(۸۲)

(قطعہ)

آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵

۶۔خفیف مسدس مخبون محذوف/مسکن مضاعف

فاعلاتن، مفاعلن، فعلن

ع مجھ کو جلتے شجر کے سائے میں، جب بھی اس نے بلایا ہوتا ہے(۸۳)

۷۔رمل مثمن محذوف/مقصور

فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن/فاعلان

ع میری وحشت جگمگائے گی زمیں کے آس پاس(۸۴)

ع جائے گا یہ روگ یہ آزار میرے ساتھ ہی(۸۵)

ع ہر قدم پر گم شدہ یادوں کا ویرانہ پڑے(۸۶)

مسافر خواہشیں فبای آلاء ربکما تکذبان

۸۔ہزج مسدس اخرب مقبوض/مقصور

مفعول، مفاعلن، فعولن

ع اپنے ہی اسیر ہو گئے ہیں(۸۷)

ع خوشبو کی طرح گزر گیا ہے(۸۸)

۹۔متقارب

فعولن

ہائے!افسوس!! میں زمینی بلائیں

۱۰۔متدارک

فاعلن

صبر ورضا کا صحیفہ دست برداری کا لمحہ

۱۱۔متدارک مسدس سالم

فاعلن،فاعلن،فاعلن

ع اک ستارے نے مجھ سے کہا(۸۹)

۱۲۔رجز

مستفعلن

اس بستی کے مکھیا

۱۳۔رمل مخبون محذوف/مقصور

فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن

ع دل کسی اور ہی امکان پہ آیا ہوا ہے(۹۰)

ع حرفِ جاں سوز ہے پیرائے تشہیر نہیں(۹۱)

ع برف پر آگ جلاتا ہوں، الجھ جاتا ہوں(۹۲)

ع اب میں دیوانۂ دنیا ہوں نہ دیوانۂ خواب(۹۳)

ع نظمِ فطرت میں مساوات ہے اچھی خاصی(۹۴)

۱۴۔سریع مسدس مطوی مکسوف/موقوف

مفتعلن، مفتعلن، فاعلن

ع رات گئی بات گئی چھوڑیے(۹۵)

۱۵۔رمل مسدس سالم

فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن

ع ایک دریائے نہاں تھا اب نہیں ہوں(۹۶)

شمس الرحمٰن کی یاد میں

۱۶۔ہندی بحر

فعلن (اساسی رکن)

بھونرا

۱۷۔بحرِ میر

فعلن ،فعلن(یہ بھی ہندی بحر ہی کا ایک آہنگ ہے۔اسے میر نے بہت برتا اور خوب برتا، گویا اسے ایک نئ شناخت دی۔اسی چیز کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے اس آہنگ کو بحرِ میر کا نام دیا اور اس کے اصول وضع کیے)

ع کانگڑی میں لوبان جلایا، برف میں شکر ڈالی ہے(۹۷)

ع سانجھ سمے جب سب آشائیں،سب سپنے مر جاتے ہیں(۹۸)

مجموعۂ کلام ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' کے عروضی مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ احمد حسین مجاہد نے نہ صرف روایتی بحور کو برتا ہے بل کہ متنوع اور پیچیدہ اوزان میں بھی اپنے تخلیقی اظہار کو کامیابی سے ہم آہنگ کیا ہے۔اکیس مختلف بحور کے استعمال سے ان کی عروض میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ان کے ہاں بحر کا انتخاب محض صوتی آہنگ تک محدود نہیں رہتا بل کہ یہ اظہار کی معنوی گہرائی اور تخلیقی تجربے کو زیادہ مؤثر بنانے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔یوں کہا جا سکتا ہے کہ احمد حسین مجاہد کی شاعری میں عروضی تنوع اور بحور پر عبور ان کی فنی بصیرت کا مظہر ہے، جس کی بدولت وہ کلاسیکی روایت اور جدید حسیت دونوں کو ایک ہم آہنگ صورت میں قاری کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

حوالہ جات:

1. منصف خان سحاب، نگارستان، مکتبۂ جمال، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۸۱
2. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۱۵۳
3. ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، مبادیاتِ بیان و بدیع و عروض، ورلڈ ویو پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص ۹۰
4. ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، مبادیاتِ بیان و بدیع و عروض، ورلڈ ویو پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۲ء، ص ۹۱
5. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، کولاج پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۵ء، ص ۱۳
6. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۱۰۳
7. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۱۵
8. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۱۷
9. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۲۱
10. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۲۳
11. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۲۵
12. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۲۷
13. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۲۹
14. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۳۱
15. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۳۹
16. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۴۱
17. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۴۳
18. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۴۵
19. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۴۷
20. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۴۹
21. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۵۱
22. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۵۳
23. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۵۵
24. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۶۳
25. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۶۵
26. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۶۷
27. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۶۹
28. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۷۱
29. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۷۳
30. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۷۵
31. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۷۷
32. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، ایضاً، ص ۷۹

33. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۸۸
34. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۸۹
35. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۹۱
36. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۹۳
37. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۹۵
38. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۹۷
39. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۹۹
40. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰۱
41. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰۴
42. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰۸
43. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۱۱
44. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۱۲
45. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۹
46. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰
47. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰۵
48. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰۵
49. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰۵
50. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰۵
51. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰۵
52. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰۵
53. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰۶
54. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰۶
55. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰۶
56. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰۶
57. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰۶
58. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰۶
59. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۰۶
60. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۲۹
61. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۷۱
62. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۷۹
63. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۱
64. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۱۵
65. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۲۱
66. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۲۷
67. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً، ص۴۵

68. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۵۳
69. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۶۵
70. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۸۹
71. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۹۱
72. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۱۰۸
73. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۱۷
74. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۹۱
75. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۵۵
76. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۹۳
77. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۹۵
78. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۱۰۴
79. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۱۹
80. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۳۷
81. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۷۷
82. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۸۸
83. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۲۳
84. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۲۵
85. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۶۹
86. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۹۹
87. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۳۱
88. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۴۳
89. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۶۳
90. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۳۹
91. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۵۱
92. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۶۷
93. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۵۷
94. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۹۷
95. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۴۷
96. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۱۰۱
97. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۴۱
98. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۱۱۲
99. احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے،ایضاً،ص۱۱

باب پنجم:

حاصلِ تحقیق

موجودہ نظم و نثر کی دنیا میں شناسا نام احمد حسین مجاہد کا بھی ہے۔ ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' آپ کا تیسرا اردو شعری مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ کلام احمد حسین مجاہد کے مجموعہ کلام ''اوک میں آگ'' (۲۰۱۴ء) کے گیارہ برس بعد منظر عام پر آیا ہے جب کہ آپ کا پہلا شعری مجموعہ ''دھند میں لپٹا جنگل'' ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا تھا۔

مجاہد نے اپنی سابق روایت پہ چلتے ہوئے اس مجموعہ کلام میں تھوک کے حساب سے اشعار نہیں شامل کیے بل کہ انھوں نے اس میں اپنا گیارہ برسوں پہ مشتمل انتخاب شامل کیا ہے۔ ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں بائیس (۲2) نظمیں، اڑتیس (38) غزلیں اور چودہ (14) متفرق اشعار شامل ہیں۔ اس مجموعے میں احمد حسین مجاہد نے اکیس (۲۱) مختلف بحور میں تجربات کیے ہیں۔

اردو ادب کے موجودہ منظر نامے میں احمد حسین مجاہد کی شخصیت اور ان کے شعری سرمائے کا مطالعہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ان کی تخلیقات کو محض انفرادی جذبات کے اظہار تک محدود نہ سمجھا جائے بل کہ انھیں عہد کی اجتماعی دستاویز کے طور پر بھی دیکھا اور پرکھا جائے۔ مجاہد کی شاعری فرد کی داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ سماج کی اجتماعی نفسیات کو بھی ہمارے سامنے واضح کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں جہاں ذات کی تنہائی، ہجر کی کسک اور وصال کی آرزو ملتی ہے وہاں سماج کے دکھ، عصری المیے اور اجتماعی شعور کی جھلک بھی پوری شدت سے نمایاں ہے۔ ان کی شاعری جذبات و احساسات کی محض تجلی نہیں بل کہ یہ اپنے سماج سے جڑی ہوئی ہے۔

شاعر کا یہ رجحان محض تاثراتی نہیں بل کہ ایک شعوری اور فکری رویہ ہے۔ وہ اپنی داخلی واردات کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ وہ فرد سے نکل کر قارئین کی اجتماعی نفسیات کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجاہد کی شاعری میں شخصی تجربات بھی ایک وسیع تر تناظر میں قاری کو اپنے عہد سے روشناس کراتے ہیں۔ ''شہر کے دوسرے کنارے سے'' اس حوالے سے نہایت اہمیت کا حامل مجموعہ ہے جس میں شاعر نے فرد کی داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کے مسائل اور تضادات کو بھی اپنی تخلیقی توانائی کا حصہ بنایا ہے۔

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مجاہد کا فن محض تاثراتی کیفیت یا داخلی جذبات کا عکس نہیں بل کہ ایک سماجی اور اجتماعی حقیقت کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ ان کی شاعری کا بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ انسانی رشتوں، معاشرتی ناانصافیوں اور زندگی کے تضادات کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ وہ قاری کے ذاتی تجربات کا بھی حصہ محسوس ہوتے ہیں۔

مزید برآں، مجاہد کی شاعری کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ادب کو نعرے بازی تک محدود نہیں کرتے۔ وہ معاشرے کی ناہمواریوں اور استحصالی رویوں کو نہ صرف اجاگر کرتے ہیں بل کہ ان کے پس منظر میں موجود فکری اور تہذیبی کمزوریوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ ان کا سماجی شعور ایک بصیرت ہے، جو معاشرتی ناہمواریوں، استحصالی رویوں، محرومیوں اور ناانصافیوں کو اجاگر کرتی ہے۔

''شہر کے دوسرے کنارے سے'' میں احمد حسین مجاہد نے سادہ، رواں اور عام فہم زبان استعمال کی ہے۔ تشبیہات و استعارات پر انہیں فن کارانہ دسترس حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی اسلوب اور فنی چابک دستی کی جھلک نمایاں ہے۔۔ انھوں نے علم بیان وبدیع کے محاسن کا مؤثر استعمال کیا ہے جن میں مراعات النظیر، صنعتِ تکرار، صنعتِ تضاد، تجنیس وغیرہ شامل ہیں۔ مجاہد کی شاعری اپنے عہد کے مسائل کی ایک فکری اور جمالیاتی تشریح ہے۔ وہ محض جذباتی ردعمل تک محدود نہیں رہتے بل کہ اپنی تخلیقات کے ذریعے قاری کو سوچنے اور سوال اٹھانے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہی عمل ان کی شاعری کو محض ادبی اظہار سے آگے بڑھا کر ایک فکری اور سماجی دستاویز کی صورت دیتا ہے۔

مزید یہ کہ احمد حسین مجاہد سماج کو ایک ایسی اکائی کے طور پر دیکھتے ہیں جو مسلسل تغیر پذیر ہے۔ وہ سماجی ارتقا اور معاشرتی تبدیلی کو نہایت باریک بینی سے محسوس کرتے ہیں اور اسے شعری قالب عطا کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں ماضی کی بازگشت بھی ملتی ہے اور حال کی کیفیات بھی پوری شدت سے ابھرتی ہیں۔

وہ سماج کو ایک متحرک اور متبدل اکائی کے طور پر دیکھتے ہیں اور ان کی کاوش یہی ہے کہ قاری کو اپنے عہد کے مسائل سے روشناس کروایا جائے۔ مجاہد کی شاعری محض جمالیاتی تجربے کا اظہار نہیں بل کہ سماجی اور فکری آگہی کا ایک جیتا جاگتا حوالہ بھی ہے۔ وہ اپنے عہد کی پیچیدگیوں اور تضادات کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بل کہ انہیں فن کے ذریعے قاری تک پہنچاتے ہیں۔

آخر میں یہ حقیقت نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ مجاہد کی شاعری فرد اور سماج کے درمیان ایک ایسا ربط پیدا کرتی ہے جو قاری کو اپنے وجود اور اجتماعی زندگی دونوں سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ ان کے کلام کو پڑھ کر قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ انسانی عظمت، اس کی جدوجہد اور بہتر مستقبل کی آرزو ہی فن کا اصل حاصل ہیں۔

یوں دیکھا جائے تو احمد حسین مجاہد کی شاعری میں داخلی جذبات، ہجر و وصال کی واردات، عصری اور سماجی شعور، ماضی کی مراجعت اور مستقبل کی امید سب یکجا ہیں۔ ان کا فن فرد کی داخلی کائنات سے نکل کر ایک اجتماعی شعور میں ڈھل جاتا ہے اور یہی ان کے شعری سفر کا سب سے نمایاں حاصل ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

احمد حسین مجاہد، شہر کے دوسرے کنارے سے، کولاج پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۵ء

ثانوی مآخذات:

احمد حسین مجاہد، دھند میں لپٹا جنگل، عکاس پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء

احمد حسین مجاہد، صفحۂ خاک، اہتمام پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۷ء

احمد حسین مجاہد، اوک میں آگ، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

احمد حسین مجاہد، تُھڑے خواب دی چھائی، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء

ارشد محمود ناشادؔ، ڈاکٹر، مبادیاتِ بیان و بدیع و عروض، ورلڈ ویو پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۲ء

انعام الحق، احمد حسین مجاہد کی غزل میں جمالیات، تحقیقی مقالہ برائے بی۔ایس اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج ہری پور، ۲۰۱۹ء

بشیر احمد سوزؔ، ہزارہ میں اردو زبان و ادب کی تاریخ، ادبیاتِ ہزارہ، ایبٹ آباد، جون ۲۰۱۰ء

پروفیسر ایوب صابرؔ، ادبستانِ ہزارہ، بزم اہل قلم ہزارہ، ایبٹ آباد، اگست ۱۹۸۹ء

سعدیہ برجیس ملک، ''آزاد کشمیر کی ادبی انجمنیں''، تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۸۶ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2019ء

سید عابد علی عابد، البیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء

سید عابد علی عابد، البدیع، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء

شمس الرحمٰن فاروقی ''بلاغت کیا ہے؟'' مشمولہ ''درس بلاغت''، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء

شمس الرحمٰن فاروقی، شعر، غیر شعر اور نثر، پورب اکادمی، اسلام آباد، 2014ء

صادق، ڈاکٹر ''علم بیان''، مشمولہ ''درس بلاغت''، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء

محمد قدیر، احمد حسین مجاہد کی شاعری: تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل اردو، ہزارہ یونی ورسٹی، مانسہرہ، ۲۰۲۲ء

مرزا اسد اللہ خان غالبؔ، دیوانِ غالب، نواب سنز پبلی کیشنز، راولپنڈی، س۔ن

منصف خان سحاب، نگارستان، مکتبۂ جمال، لاہور، ۲۰۱۷ء

میر تقی میرؔ، کلیاتِ میرؔ، مرتب: یوسف مثالیؔ، عبداللہ اکیڈمی، اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۲ء

نجمی رام پوری، حکیم نجم الغنی خاں، بحر الفصاحت، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، جلد دوم، مارچ ۲۰۰۶ء

انٹرویوز:

خصوصی نشست ہمراہ احمد حسین مجاہد، انٹرویو نگار: سراج احمد تنولی، روزنامہ سرگرم، ایبٹ آباد، ۱۶ فروری ۲۰۱۹ء

لغات:

سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگِ آصفیہ، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۰ء

نور الحسن نیرّ مولوی، نور اللغات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء

شان الحق حقی، فرہنگِ تلفّظ (نستعلیق ایڈیشن)، ادارہ فروغِ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۷ء